بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ بیدل حیدری

انٹرنیشنل

ادب و ثقافت

13

مدیران

شکیل سروش ، شیخ اعجاز

معاونِ مدیران

طارق ہاشمی، عامر شریف

برائے رابطہ (شکیل سروش)

Phone:+414-943-7000, +414-943-5594
E-mail:adabosaqafat@gmail.com
shakeelsarosh@gmail.com

برائے رابطہ (شیخ اعجاز)

178-Bamboo, Ave, SE., Palm Bay, FL.32909, U.S.A.
Phone:321-674-9837
Sheikh.ijaz.ahmed@gmail.com

www.adab-o-saqafat.com

زیرِاہتمام

اَدب وثقافت، امریکہ

Adab-o-Saqafat,U.S.A

اپنی نگارشات بھجوانے کے لیے

بذریعہ ای میل

adabosaqafat@gmail.com
shakeelsarosh@gmail.com

بذریعہ ڈاک (امریکہ)

178-Bamboo, Ave, SE., Palm Bay,
FL.32909, U.S.A.

بذریعہ ڈاک (پاکستان)

ادب وثقافت

پوسٹ آفس روڈ، چیچہ وطنی (ساہیوال)

ناشر

محمد عابد

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد، پاکستان
Phone:+92 412615359- 2643841, Cell:0333-9933221
E-mail:misaalpb@gmail.com

قیمت: 200 روپے

فہرست

○ حمد ناصر ملک ۷ ○ نعت انور شعور ۸

مضامین

چوتھا کونا دھندلا خاکہ اور احمد ہمیش محمد حمید شاہد ۹
ابد کے طاق پہ رکھے ہوئے چراغ عبدالعزیز ساحر ۱۵
ابد کے طاق پہ رکھے ہوئے چراغ — تجزیاتی مطالعہ طارق ہاشمی ۲۶

غزلیات

بیدل حیدری ۳۱	آصف شیخ ۳۳	آصفہ نشاط ۳۵
آفتاب احمد ۳۶	اجمل سروش ۳۸	ارشد عباس ذکی ۳۹
ارشد سعید ۴۰	اشرف یوسفی ۴۱	اعظم توقیر ۴۲
افروز عالم ۴۳	افضل خان ۴۴	افضل گوہر ۴۵
امتیاز الحق امتیاز ۴۶	انور شعور ۴۷	اوصاف شیخ ۴۸
باقی احمد پوری ۴۹	تنویر سیٹھی ۵۰	خالد ملک ساحل ۵۱
خاور جیلانی ۵۲	ڈاکٹر کوثر محمود ۵۳	سرور ارمان ۵۴
سلمان بشیر ۵۵	سہیل ثاقب ۵۶	سیّد احمد حسین ۵۷
شاہین عباس ۵۸	شکیل سروش ۶۰	شیخ اعجاز ۶۱

صفی حسن ۶۲
طارق ہاشمی ۶۳
طاہر شیرازی ۶۴
عامر شریف ۶۵
علینا عترت ۶۶
عمران شناور ۶۷
فاروق طراز ۶۸
مامون ایمن ۶۹
مبشر سعید ۷۰
محمد مختار علی ۷۱
مرشد سعید ناصر ۷۲
منصور آفاق ۷۳
ناصر بشیر ۷۵
ندیم بھابھہ ۷۷
نصرت صدیقی ۷۸
وصی نقاش ۸۰

نظمیں

ہاتھوں پر لکھی ہوئی موت	احمد سہیل	۸۱
کیٹ واک۔ وقت ناوقت	الیاس بابر اعوان	۸۲,۸۳
خارجی مظاہر	عطا تراب	۸۴
رُباعیات	مامون ایمن	۸۵
دوہے	محسن مگھیانہ	۸۶
لوری (ایک زلزلہ زدہ لڑکی کے منظوم الفاظ)	ناصر ملک	۸۷

افسانے

کاغذ کے پُرزے	نیلم احمد بشیر	۸۹
اُلٹے پاؤں	محمد حامد سراج	۹۴
روشنی کا ننگ	اصغر بلوچ	۱۰۲
قرض	آبگینے شاہ	۱۰۵
کلاس فیلو!	حافظ حیات	۱۱۰

اداریہ

ادب زندگی کا آئینہ ہے تو اس کے اندر زندگی جیسی چہل پہل ہونی چاہیے۔ادب کو جامد نہیں ہونا چاہیے نہ ہی منجمد اقدار کا حامل ۔اُردو غزل اور نظم کے رواں تخلیقی سرمائے میں یہ اَمر بہت اطمینان بخش ہے کہ اِس شاعری میں زندگی کا ہنگامہ اور رونق بہت بھر پور انداز میں ملتی ہے۔ ہمارے شعرا اپنے ماحول کے مسائل اور افراد کے طرزِ زندگی کو اِس طرح پیش کر رہے ہیں کہ یہ سرمایۂ شعر ''اوراقِ مصوّر'' کی مانند ہو گیا ہے، بقول خواجہ حیدر علی آتش:

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصوّر پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے ،نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

ایک اور شعر میں آتش نے شعرا کے تخلیقی عمل کو یوں سپاسِ تحسین پیش کیا ہے:

مکیں ہر معنی روشن ، مکاں ہر بیتِ موزوں ہے
غزل کہتے نہیں ہم ، چند گھر آباد کرتے ہیں

مگر یہ اَمر سوچنے والا ہے کہ غزل میں تو شاعر چند گھر آباد کر لیتے ہیں، کیا معاشرے میں بھی گھروں کی خانہ آبادی کا کوئی سامان ہے یا تباہی و بربادی کے اسباب کا تسلسل جاری رہے گا۔ وطنِ عزیز میں ہر طرف سے کشت وخون کی خبروں کی آمد کب آئے گی۔سوال یہ بھی ہے کہ اس غارت گری کی بنیادیں کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی ایسا نظریاتی خلا یا اِختلاف ہے، جس کی بنیاد پر انسانی جانوں کی بازی لگا دی جائے؟

ہمارا نہیں خیال کہ ایسے کوئی مسائل بھی ہیں جن کی وجہ سے قتل و غارت ہو یا امن و امان کے مسائل ہوں۔

قابلِ غور بات تو یہ بھی ہے کہ ہم دوسروں کی جنگ کب تک لڑیں گے۔ ہمارا اِشارہ محض عالمی طاقتوں کی طرف نہیں بلکہ ترقی یافتہ اسلامی ممالک کی طرف بھی ہے جو چھوٹے ملکوں میں

اپنے اپنے فرقے کی سوچ کے تسلط کے لیے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رہے ہیں؟ اختلاف اپنی جگہ مگر انسانی جان کی اہمیت اور قیمت کا اندازہ بھی تو لگانا چاہیے۔ اِس وقت تو جو صورتِ حال ہے، اُس کے مطابق:

عرش پاتال ہو گئے میرے　　　لوگ بدحال ہو گئے میرے
شہر ویران ہو گیا یکسر　　　باغ پامال ہو گئے میرے
کوئلیں میری ہو گئیں خاموش　　　مور بے چال ہو گئے میرے
کوئی منظر کہیں بچا ہی نہیں　　　خواب کنگال ہو گئے میرے

سب سے زیادہ پریشانی کا عنصر یہی ہے کہ خواب کیوں کنگال ہوئے؟ آیئے سوچیں پلکوں کی جھولیاں پھر کب بھریں گی۔

مُدیران

ناصر ملک

حمدِ باری تعالیٰ

دُنیا کی ہر زبان کا حُسنِ ادا وہی
اپنا خدا جو آپ ہے ، میرا خدا وہی

اپنا خیال آپ تو اپنا بدن بھی آپ
پوچھا گیا 'وہ کون ہے' دل نے کہا 'وہی'

دستِ عطا سے منظروں کو بھی ملی زباں
صحنِ خیال میں نظر آتا رہا وہی

کوئی بھی سوچ اُس کا احاطہ نہ کر سکی
دے کر شعور و آگہی سب پر کھلا وہی

یوں تو سبھی جہان میں ہیں معترف مگر
جو اُس کے عشق میں ہے یقیناً جدا وہی

نظمِ سخا پہ میرے دل و جان بھی نثار
لازم تھا نقشِ پائے محمدؐ ، مِلا وہی

ناصرؔ جو قلب و جان پہ چھایا رہا سدا
عقلِ جہاں سے آج بھی ہے ماورا وہی

●●●

انور شعور

اے رحمتِ تمامﷺ

اے رحمتِ تمام توجہ کا ہے مقام رہتے ہیں اِبتلا و اذیت میں خاص و عام
کٹتی ہے عافیت سے ہماری سحر نہ شام ناقابلِ قیاس موانع ہیں گام گام
اے رحمتِ تمامﷺ

سونے کے مول ہو گئی مٹی ، خدا کی شان مہنگائی لے رہی ہے شب و روز امتحان
سستی ہے کوئی شے تو فقط آدمی کی جان آبادیوں میں تیغِ تشدد ہے بے نیام
اے رحمتِ تمامﷺ

دیہات ہوں کہ شہر ، کہاں ظلم کم کہیں اپنی زمین پر نہیں محفوظ ہم کہیں
چلتی ہیں گولیاں کہیں ، پھٹتے ہیں بم کہیں اِس فتنہ و فساد سے ہے زندگی حرام
اے رحمتِ تمامﷺ

انسان ہو گیا ہے فقط ذات کا اسیر سود و زیاں کا صید ، حسابات کا اسیر
اغراض کا غلام ، مفادات کا اسیر دُنیا میں رہ گیا ہے خلوص و وفا کا نام
اے رحمتِ تمامﷺ

ہم کیوں ترس رہے ہیں نشاط و سرور کو معلوم ہے ہماری کہانی حضورﷺ کو
ہمت کہاں کلام کی انور شعور کو فرمایئے قبول یہ نذرانۂ سلام
اے رحمتِ تمامﷺ

محمد حمید شاہد

چوتھا کونا دھندلا خاکہ اور احمد ہمیش

یہ کوئی بیس بائیس سال پرانا واقعہ ہے ؛ جون کا مہینہ تھا۔شاید دوسرا ہفتہ رہا ہوگا میں اندرونِ سندھ سے گھومتا اور وہاں کی شدید گرمی سے اُکتایا ہوا کراچی پہنچا تھا اور خواہش کرنے لگا تھا کہ کراچی کے کچھ ادبی دوستوں سے ملاقات ہو جائے۔کیسے؟ کہ میرے پاس کسی کا فون نمبر تھا، نہ اتا پتا۔خیر اُن دنوں ،محمود واجد کا'' آئندہ'' باقاعدگی سے نکل رہا تھا۔یاد آیا اُن کا ایک پرچہ، میں گھر سے نکلتے ہوئے بیگ میں ڈال لایا تھا؛ اُسے نکالا۔وہاں محمود واجد کا فون نمبر موجود تھا۔اُنہیں فون کیا۔اگلے ایک گھنٹے میں وہ لیاقت آباد چورنگی ڈالمن آرکیڈ میں میرے پاس تھے اور پھر ہم شہر میں جس آدمی کی طرف جا رہے تھے۔محمود واجد کا کہنا تھا؛اس نے شہر میں کسی سے بنا کر نہیں رکھی ہوئی تھی۔ناظم آباد کے علاقے میں سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹے سے کمرے میں میرے ایک ایسے شخص سے ملاقات ہونا تھی،جس کے بارے میں میں اب یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے آپ میں کناروں تک بھرا ہوا تھا۔میں نے اس شخص کے نام کی گونج ادبی دنیا میں سن رکھی تھی اور اب اُسے دیکھنے کے لیے مشتاق تھا۔میں یاد کرتا ہوں کہ میں کمرے میں گھسا تھا؛ایک ایسے کمرے میں جس میں کسی بھی اور شخص کے گھس بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔میں تصور کر سکتا ہوں کہ وہ سامنے تھا؛ مناسب قامت اور اُلجھے ہوئے بالوں والا۔بالکل اسی کمرے جیسا تھا جس میں کوشش کر کے میں اندر گھس گیا تھا۔جی،ایک ایسا کمرہ جس کا اپنا خستہ پن اس کی دیواروں میں،کرسیوں اور میز میں، کتابوں اور رسالوں میں،حتیٰ کہ فرش اور چھت میں بہت شدت سے بھرا ہوا تھا۔ویسا کمرہ ''تشکیل'' کے دفتر کے سوا کسی کا ہو ہی نہیں سکتا تھا اپنے آپ میں بھرا ہوا۔

اب مجھے یاد آتا ہے کہ تب میری احمد ہمیش سے ملاقات نہ ہوئی تھی یہ تو ایک آدھ سال بعد ہوئی تھی جس میں میرا تخیل ہر بار کاٹ پھانس کر دیتا ہے؛ یوں جیسے احمد ہمیش وہیں تھے؛ اس کمرے میں جو تشکیل کا دفتر تھا اسی کا حصہ۔خیر واقعہ یہ ہے کہ احمد ہمیش وہاں نہیں تھے۔وہاں تو

ایک منحنی سی سانولی سی، چھوٹے قد والی لڑکی تھی انجیلا؛ اوراس نے بتایا تھا کہ بابا آنے ہی والے تھے؛ اس نے اصرار کیا تھا کہ ہم بیٹھیں وہ آئیں گے تو بہت خوش ہوں گے مگر محمود واجد وہاں رُک جانے کو تیار نہ تھے۔ہم واپس آ گئے ۔ بعد والی ایک ملاقات ہر بار اس میں مدغم ہو جاتی ہے ۔ جی احمد ہمیش سے ایک اور ملاقات ؛ جو ہمیشت والی ''میں'' سے پوری طرح اور پنجابی محاروے کے مطابق ''لتڑ لتڑ'' کر بھری ہوئی تھی۔

تو یوں ہے کہ جس احمد ہمیش کو میں جانتا ہوں وہ زہر میں بجھا ہوا نشتر تھا۔اس کے جریدے ''تشکیل'' کی پیشانی پرایک اصطلاح لکھی ہوئی ہوتی تھی ''شاک انگیز''۔تو ایسا ہے کہ اُس کی شخصیت بھی شاک انگیز تھی ۔ مجھے یاد ہے کہ احمد ہمیش سے بعد والی ملاقات کے بعد میری جو دو ملاقاتیں ہوئی تھیں اُن دونوں کا منشایاد کا حوالہ آ جاتا ہے ۔ان آخری دو ملاقاتوں میں پہلی ''آدھی ملاقات'' تھی اور اس کا سبب منشایاد کا ایک ایسا بیان بنا تھا جسے میں وعدہ معاف کی گواہی سے تعبیر دیتا آیا ہوں۔آپ جانتے ہیں کہ منشایاد نے علامت نگاروں اور تجرید نگاروں کے ساتھ ان جیسا افسانہ بھی لکھا مگر یہ ان کا غالب رجحان نہیں تھا۔ میرے افسانوں کے دوسرے مجموعہ ''جنم جہنم'' پر لکھتے ہوئے تو وہ اس علامتی اور تجریدی افسانے پر لگ بھگ برس پڑے تھے۔منشایاد نے ستر کی دہائی کو افسانے سے کہانی کے برگشتہ ہونے کا زمانہ قرار دیا تھا کہ بہ قول ان کے اس زمانے میں 'زوال آمادہ لکھنوی شاعری کی یاد پھر سے تازہ ہونے لگی تھی' داستانوی صنائع بدائع کی جگہ صفت درصفت اور لفظی بازی گری کا احیاء ہو گیا تھا اور نئے افسانے کے نام پر اتنی لفظی پتنگ بازی ہوئی کہ آسمان ڈھک گیا۔تب پلٹ کر دیکھا گیا تو وہاں نقاد تھا نہ قاری۔' منشایاد نے تب احمد ہمیش کے ہاں محض ''مکھی'' کے بچ رہنے کی بات کی تھی۔

اس بیان پر مجھے دو شدید ردعمل موصول ہوئے؛ ایک خالدہ حسین کا کھلا خط جس میں مدلل بات کی گئی تھی اور دوسرا احمد ہمیش کا زہر بند خط۔ خالدہ حسین کا کھلا خط میں نے ''استعارہ'' میں چھاپ دیا تھا۔اوراحمد ہمیش کا زہریلا خط جس میں پنڈی افسانے کے سکول پر شدید حملے کیے گئے تھے اور انہیں حشرات الارض کہہ کر پکارا گیا تھا، میں پی گیا۔ پھر بیچ میں کئی سال بیت گئے اور ہماری آخری ملاقات اسلام آباد میں ہوئی ۔ اکادمی ادبیات نے ان سے ادبیات کا نثری نظم (کہ جسے میں بہ اصرار نثم کہتا ہوں) پر ایک خاص نمبر مرتب کروایا تھا اور اسی سلسلے کی ایک تقریب ان کی صدارت میں ہوئی تھی ۔ میں اس تقریب میں نہیں گیا تھا تاہم اُسی روز منشایاد کے ہاں ''افسانہ منزل'' میں ہم

اکٹھے ہوئے تھے۔تب وہ اسی پنڈی سکول اور منشایاد کے گن گا رہے تھے اور مجھے بھی لائقِ اعتنا جانا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں ہمیشہ ''تشکیل'' میں چھپنے سے مجتنب رہا۔تشکیل، جس پر میرا خیال ہے ''ہمیشت'' کی ایسی چھاپ تھی کہ کسی اور کا تخلیقی وجود پوری طرح اس کے اوراق میں سانس نہ لے پاتا تھا۔

احمد ہمیش کا نام انور سجاد، رشید امجد سریندر پرکاش اور بل راج مینرا کے ساتھ لیا جاتا رہا مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ بریکٹ ہونے پر چڑتے تھے۔انہیں اپنی بالکل الگ شناخت پر اصرار تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد، وہ ہجرت کر کے ادھر آئے اور بوجوہ واپس چلے گئے۔ دوبارہ آئے تو کراچی میں بس گئے۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''مکھی'' 1966 میں حیدرآباد دکن سے چھپا تھا۔ میں نے یہ مجموعہ نہیں دیکھا تاہم اس میں شامل افسانہ ''مکھی'' کو اُن کے دوسرے مجموعہ ''کہانی مجھے لکھتی ہے'' میں پڑھا جو 1970 میں چھپی تھی۔ یہ کہانی بھی اس مجموعے میں بھی شامل کر لی گئی تھی۔ کہتے ہیں افسانہ ''مکھی'' پہلی بار شائع ہوا تو خوب ہنگامہ اُٹھا تھا۔ کہا گیا ایک نیا اسلوب وضع ہو گیا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی نے احمد ہمیش کو کلٹ آف اگلی نیس کا نمائندہ افسانہ نگار کہہ کر سب سے الگ دکھایا تو احمد ہمیش کو اس طرح الگ ہو کر دکھنا اچھا لگا تھا۔ پھر وہ ساری عمر اسی فضا میں رہے۔افسانہ ''مکھی'' کی فضا کیا تھی؛ تعفن، بدبو، فضلات، غلاظت اور کثافت۔ رذیل جذبوں سے لتھڑے ہوئے آدمی کا ظاہر نامہ۔ خبث، ذلالت اور کمینگی سے بھرا ہوا باطن۔ تو یوں ہے کہ ایک مہذب صاف ستھرے ماحول کی ضد اور صاف ستھرے ماحول کی تکفیر۔

خیر بات ہو رہی تھی احمد ہمیش کے افسانے کے سروکاروں کی تو ایسا ہے کہ انہوں نے ''1970 کے بعد نئی اُردو کہانی'' کا عنوان جما کر لکھا تھا:

> ''دھیان سے دیکھا جائے تو برصغیر میں بسنے والے باشندوں کو اجتماعی بے گھری کا پہلا تجربہ تو ''ہرش وردھن کی موت کے بعد ہوا تھا۔ دوسرا تجربہ بہادر شاہ کے زوال کے بعد ہوا، تیسرا تجربہ برصغیر کی تقسیم کے سمے ہوا اور چوتھا تجربہ مشرقی پاکستان کے انقطاع کی صورت میں ہوا اس طرح ہجرت کا کشادہ وسیع کینوس مزید وسیع ہوتا چلا گیا۔''

بچھڑنا اور بچھڑتے چلے جانا اور وہ بھی ایک وسعت بھرے تناظر اور پھر ملنا ایک تنگ نائے میں، یا ایک اندھیری کوٹھڑی کی سی ہڈیوں کے اندر یخ کی طرح گھس جانے والی زندگی میں تو یہ احمد ہمیش کا تخلیقی مسئلہ بنا۔ میں نہیں سمجھتا کہ احمد ہمیش کی کہانی اسٹریم آف کانشس نیس کی کہانی ہے

کہ واقعہ اس میں سے منہا نہیں ہوتا۔ ہاں وہ موجود کو بہت پیچھے اور بہت گہرائی میں جا کر دیکھتا جو دیکھتا اس میں اپنا گہرا حزن، شدت بھرا ملال اور تندی والا احتجاج اپنے وجود سے نکال کر بھر دیا کرتا تھا اتنا کہ بسا اوقات پڑھتے ہوئے اُسے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ احمد ہمیش نے ''اپنے افسانے ''پُل اینڈ پش'' آسمان کی طرف حسرت سے دیکھا تھا اور اس پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ 'مملکت میں کوئی آدمی طبعی موت نہیں مر رہا تھا لوگ اچانک غائب ہو جاتے تھے۔' مرنے والوں، غائب ہونے والوں اور مارنے والوں یا غائب ہونے والوں کا پتا نہ چلتا تھا' کہانی میں یہ محمد تغلق کا زمانہ تھا اور اب پڑھتا ہوں تو مجھے آج کا زمانہ لگتا ہے۔ احمد ہمیش کے افسانے کی مملکت ''کرائے کی مملکت'' تھی جس میں قرض پر قرض لیا جا رہا تھا۔ شہریوں کی ریڑھ کی ہڈیوں کا گودا بھی ٹیکس میں جا رہا تھا اور کسر رہ گئی تھی تو یہ کہ پیدا ہونے سے بہت پہلے پیٹ والیوں کے پیٹ سے حمل نکال لیے جائیں؛ تو یہ تھا تب کا منظر نامہ مگر کیا اس میں ہڈ بیتی اور آج کا منظر نامہ بھی شامل نہیں ہو گیا ہے۔ سو ایسی زمانے میں کہ جب طبعی موت نہ مرنے کا چلن ہو چلا ہے احمد ہمیش طبعی موت مر گئے ہیں۔ شاک انگیز زمانے میں طبعی موت۔

تاہم ماننا ہوگا کہ جدید افسانے کا ایک اہم حوالہ احمد ہمیش بنے اور جب وہ مر گئے تو خبر کی سرخی جمائی گئی ''مکھی کے خالق احمد ہمیش انتقال کر گئے''۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے لیے ''اُردو افسانے کی روایت'' مرتب کرتے ہوئے، عین اس زمانے میں کہ جب احمد ہمیش کا خوب خوب چرچا تھا، مرزا حامد بیگ نے اُن کی اسی کہانی کو اس انتخاب میں جگہ نہ دی تھی؛ اس کہانی کو نہ کسی اور کہانی کو۔ اور ہمارے احمد جاوید نے جب ''منزل'' کے لیے افسانوں کا ایک انتخاب کیا تو ''مکھی'' یا احمد ہمیش کی کوئی کہانی اس میں بھی نہ تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے آج ''کل کا جدید افسانہ'' موضوع نہیں بن پا رہا ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ ''مکھی'' اُردو افسانے کی تاریخ کا حصہ بن گئی ہے؛ جی اردو افسانے کی تاریخ اور روایت کا حصہ؛ بالکل ایسے ہی جیسے علامتی اور تجریدی افسانہ لکھنے والے چاہے، جیتے جی مضمحل ہو کر ایک طرف بیٹھ گئے ہوں مگر اُن کا تجربہ تاریخ کا حصہ ہے اور کچھ اخذ بھی کرنے والے اس سے بھی اخذ کر رہے ہیں۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جس طرح علامت لکھنے والوں کی زندگی میں ہم نے علامتی افسانے کو لگ بھگ الگ تھلگ کر دیا ہے احمد ہمیش کو بھی ان کی زندگی میں الگ تھلگ کرنے کا بلکہ سچ کہوں تو بھلا دینے کا سلسلہ آغاز پا چکا تھا۔ مگر کیا مرنے کے بعد یہ افسانہ نگار ققنس کی طرح اپنی ہی راکھ سے پھر سے جی اُٹھنے کی سکت رکھتا ہے یہ

سوال اب ہمارے سامنے ہے۔''ہمیش نظمیں'' والے احمد ہمیش کی ایک نثری نظم 1962 ماہنامہ ''نصرت'' لاہور میں چھپی تھی، جو بہ قول ان کے انہوں نے 1961 میں لکھی تھی اور جسے وہ اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے رہے کہ یہ اردو میں پہلی نثری نظم تھی اور اسی کی بنیاد پر وہ اس صنف کے بانی ہونے کے مدعی تھے۔ وہ فن پارہ یوں تمام ہوتا تھا:

''سائبان کے تیسرے کونے میں پہلی دھوپ چمکنے لگی
پہلا کونا دوسرے کونے کا دشمن ہے
اور چوتھے کونے میں دھندلے خاکے ہیں''

اِسی چوتھے کونے میں احمد ہمیش کا دُھندلا خاکہ پڑتا ہے۔انہوں نے اپنے افسانے''اگلا جنم'' میں ایک سطحی سورج کی بات کی تھی جو چار ارب آدمیوں، ان کے جانوروں، کیڑے مکوڑوں اور نباتات پر چمکتا ہے انہیں سطحی بنانے کے لیے اور پھر بجھ جاتا ہے، دن کے معنی بدلنے کے لیے۔ احمد ہمیش کا کہنا ہے''رات کے معنی ان گنت احمقوں کی نیند ہے۔''اس افسانے میں اس نے عمروں کے ختم ہونے کی بات کی اور موت کی ڈپلومیسی کی بھی، پھر افق کا ذکر چھیڑا جسے موٹ کھڈ یعنی کھائی میں تبدیل کر دیتی ہے۔اور اس کھائی کا بھی ذکر ہوا جو موت کی عطا سے اُفق ہو جاتی ہے۔ مجھے یہ کھائی اسی نظم کا چوتھا کونہ لگی تھی۔احمد ہمیش کی کہانی ''اگلا جنم''ہمیں ایک کھائی کے کنارے لا کھڑا کرتی ہے۔ایسی کھائی جس میں بہت شور تھا۔ پھر اُس میں سے شانتی کا ایک چہرہ نکلتا ہے۔یوں کہ ہم سب اُسے دیکھنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں پھر وہ ہمارے لیے اوجھل ہو جاتا ہے۔احمد ہمیش نے اس کہانی کے آخر میں ایک جملہ لکھا تھا وہی مقتبس کرنا چاہتا ہوں۔یاد رکھیے ایک کھڈ؛ شور بھرا۔ ایک چہرہ جسے ہم دیکھنے پر مجبور تھے۔اور پھر اس چہرے کا نظروں سے اوجھل ہونا۔افسانے کے عین مین الفاظ یوں ہیں:

''کیا وہ میں تھا یا میرا اگلا جنم''

اُردو کی پہلی نثری نظم/رشم کے چوتھے کونے میں احمد ہمیش کا دُھندلا خاکہ پڑتا ہے اور اس عہد کے افسانے کا قصہ بھی۔اور ایک فاصلے سے ہی سہی مگر میں اس دھندلے خاکے سے اور دہرائے ہوئے قصے سے خود کو جڑا ہوا پاتا ہوں۔تجزیہ کرنے والے صاف صاف لفظوں میں کہنے لگے ہیں کہ کہانی کے اس اگلے جنم میں، احمد ہمیش کا خام تجربہ کہانی کا باطن بنانے کے لیے اب تخلیقی سطح پر برتا جانے لگا ہے۔وارث علوی نے ترقی پسند افسانے کو سات موٹی گایوں کا خواب لکھ رکھا

ہےاور علامتی تجریدی جدید افسانے کو سات دُبلی گایوں کا کابوس۔انہوں نے یہ بھی تو کہا تھا: جدید افسانے میں کہانی کی دُم غائب، مواد پتلا اور کردار ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو جاتے ہیں۔ جب آج کے افسانے میں کہانی مکمل ہو کر اس عذاب سے نکل آئی اور اس نے ترقی پسندوں کے مرغوب ''موٹاپے'' کو پرے دھکیل کر اپنا بیانیہ چست اور باطن گہرا کر لیا تو ہمارے محترم رشید امجد کہنے لگے:''افسانے میں کہانی لوٹ آئی ہے۔''

افسانے میں کہانی کی واپسی؟؛ جی درست، مگر یہ محض کہانی کی واپسی نہیں ہے۔ دیکھیں تو، واپس آنے والی کی رگوں میں تو گہری رمزیت لہو بن کر دوڑ رہی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں یہی رمزیت گزر چکوں کا مسئلہ بھی تو تھی۔ بجا، اُن کا مسئلہ تھی مگر وہ ادبدا کر کہانی کو ٹھکراتے ہوئے اس مسئلے کے مقابل یوں ہوتے تھے کہ کہانی کا اسٹرکچر ریزہ ریزہ ہو جاتا جب کہ آج کا افسانہ نگار کہانی سے جڑتا ہےاور اُسے نہ صرف اسے جوڑے رکھتا ہے، متن کا ڈیپ اسٹرکچر بناتا اور اس میں رمزیت تہ در تہ بچھاتا چلا جاتا ہے۔ تاہم ماننا ہوگا کہ ماقبل افسانے کا تجربہ اس باب میں خوب خوب کام آ رہا ہے۔ سو یوں ہے کہ''افسانے میں کہانی کی واپسی''،''افسانے کا نیا جنم''، احمد ہمیش اور اس کے عہد کی کہانی یا ان سے بھی پہلوں کی کہانی کا اگلا جنم تو بالکل نہیں ہے؛ ہاں افسانے کا ایسا جنم ضرور ہے جو احمد ہمیش، اُن کے ہم عصروں یا پہلے گزر نے والوں کے ذکر کے بغیر بہر حال مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

(اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام جناب احمد ہمیش کے تعزیتی جلسہ
منعقدہ رائٹرز ہاؤس اسلام آباد میں پڑھی گئی ایک تحریر)

عبدالعزیز ساحر

ابد کے طاق پہ رکھے ہوئے چراغ

بدن کی خانقاہوں میں ریاضت کے کئی موسم
سرِ شاخِ تمنّا جب مہکتے ہیں دُعا بن کر
تو اُن کی باس رنگوں کی اَنا کے زاویے تبدیل کرتی ہے
نئی تشکیل کرتی ہے

نئی تشکیل کرتی ہے اِک ایسے خیمۂ جاں کی
جہاں بھیگی ہوئی راتیں صحیفے لے کے اُتری ہوں
جہاں خوشبو عقیدت سے نئے منظر بناتی ہو
جہاں موسم وجودِ ذات کا اثبات کرتے ہوں
جہاں کثرت کے پردوں میں بس اِک منظر اُبھرتا ہو
وہی منظر حقیقت ہے

وہی منظر مدینہ ہے
مدینہ اِک حقیقت ہے
مدینہ نور و نکہت کا خزینہ ہے
مدینہ رحمۃ للعالمینی کی علامت ہے
مدینہ روشنی اور چاندنی کا اِستعارہ ہے
مدینہ آسماں ہے ایسی دھرتی کا، جسے دُنیا ازل سے آسماں کا نام دیتی آرہی ہے
اور ہنوز اِس وہم میں گم ہے
مدینہ ایسی بستی ہے کہ جس کے سامنے سارے زمانے ہاتھ باندھے سرنگوں ہیں
اس دیارِ نور کے آگے یہ ساتوں آسماں اپنی غلامی کے مقر ہیں
اور اسی شہرِ تمنّا کا طوافِ جاوِداں ان کا مقدر ہو گیا ہے
یہ فصیلِ وقت سے آگے نکل کر، واژگوں صورت بنا کر اب سلامی دے رہے ہیں
آسماں کے اُس طرف آباد بستی کے مکیں اِس شہر اور اِس شہر والے کی زیارت کرنے آتے ہیں
اَبد آباد تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا اب

مدینہ ایسی بستی ہے

جہاں خوشبو، صبا اور روشنی رُک رُک کے چلتی ہے عجب حُسنِ عقیدت سے
جہاں خوشبو: خیال وخواب کے رنگوں کی تجسیمیں رِدا کو اوڑھ لیتی ہے
وہ خاموشی سے اس شہرِ تمنّا کے گلی کوچوں میں پھرتی ہے
زیارت کرنے آتی ہے
زمیں ہو، آسماں ہو، یا ہوا ہو، یا کہانی ہو
کہانی کی طلسماتی فضا ہو، یا سفر ہو، یا سفر کے موسموں کی خوش گمانی ہو
وہ خوشبو ہو کہ خوشبو کی کہانی ہو
وہ جو کچھ ہو محبت کی زبانی ہو
مدینے کی فضا اس کو سدا آباد رکھتی ہے
ہمیشہ شاد رکھتی ہے
وہ خوشبو جب مدینے سے نجف آئی، تو اس شہرِ محبت میں
عقیدت اوڑھ کہ رقصاں رہی برسوں
مدینے سے نجف آنے کا منظر — ایک منظر تھا
وہ منظر آسماں کی آنکھ نے محفوظ کر رکھا ہے
اور اب تک اِسی منظر کو دامن میں سمو لینے پہ نازاں ہے
بصیرت اور بصارت جو کہ چشمِ آسماں میں اب تلک باقی ہے
وہ ایسے مناظر کی بقا کے رنگ اَور خوشبو سے زندہ ہے
وہ منظر ایسا منظر تھا
کہ اس جیسا کوئی منظر ازل کے روز سے لے کر فلک کی
چشمِ خوش آثار نے اب تک نہیں دیکھا
علی مشکل کُشا اس شہرِ خوش آثار کی مٹی میں خوشبو، بو رہے تھے
تا ابد آباد وہ سارے زمانے اس کی خوشبو سے مہک اُٹھیں
وہ منظر ایسا منظر تھا
جسے چشمِ فلک نے اب تلک دیکھا نہیں تھا
اور جو وہ دیکھا، تو پھر اس کو کسی منظر —
کسی منظر کے خوش آثار لمحوں کو سمونے کی کوئی حسرت؛ کوئی خواہش نہیں تھی
اور اگر کچھ تھی تو بس اتنی تمنّا تھی کہ وہ منظر، وہ خوش آثار منظر
اس کی آنکھوں کے طلسماتی جہاں میں تا ابد باقی ہی رہ جائیں

وہ خوشبو جو مدینے سے نجف آئی
کہانی اوڑھ لی اس نے
کہانی جو محبت ہے
محبت جو کہانی ہے

کہانی جو کہ خوشبو ہے
وہ خوشبو جو کہانی ہے
کہانی جو نجف کے چاک پر دستِ ہنرور کی کرامت کا عجب منظر بناتی ہے
مدینے آتی جاتی ہے
وہ خوشبو جو مدینے سے نجف کے راستے بصرے میں پہنچی تھی،
حسن بصری کے آنگن کے کسی گوشے میں تنہائی کی
صورت اوڑھ کر حُسنِ عقیدت کے عجب منظر کی تخلیقی فضا میں ڈھل گئی تھی وہ
وہ خوشبو اِک کہانی لکھ رہی تھی
اِس کہانی کے سبھی منظر مدینے شہر کے رنگوں کی خوشبو کا سراپا اوڑھ کر حُسنِ تمنّا کی نئی تعبیر لکھتے جا رہے تھے
ایک ایسے موسمِ جاں میں
وہ موسم سبز گنبد کے مکیں کی مہربانی کی علامت تھا
وہ موسم اِستعارہ تھا سفر کی اُس کہانی کا
کہانی جو سفر کے اِستعارے سے مزین تھی
وہ خوشبو تھی، سفر تھا، یا کہانی تھی
وہ اپنے سارے رنگوں میں محبت کی نشانی تھی

وہ خوشبو جو مدینے سے محبت اوڑھ کر شہرِ نجف کے راستے بصرے میں پہنچی تھی
وہاں سے شام ہوتی، خواجگانِ چشت کی بستی کے سارے
موسموں کے خواب میں تحلیل ہو کر جب دیارِ خواجۂ اجمیر
آئی تھی، تو خاموشی کے حجرے میں مراقب ہو گئی تھی وہ
وہ خوشبو موسموں کے اَن گنت رنگوں میں گھل مِل کر
کرامت کا لبادہ اوڑھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور زمانے ہاتھ باندھے اُسے کے آگے دھیان کے موسم میں گم تھے
اور کہانی اِک نئے اسلوب میں ڈھل کر
ابد کے طاق پر رکھے دیے کو آگہی کے نور سے ایسا
بڑھاوا دے رہی تھی، جو خیال و خواب اور اس کی
طلسماتی فضا کا اِستعارہ تھے
کہانی اپنے پس منظر کا ایسا پیش نامہ لکھ رہی تھی جو کہ دہلی کی طرف محوِ سفر تھا
اس سفر میں اب کہانی اِک نئی دُنیا کے سارے موسموں کو اپنی آغوشِ محبت میں سمو لینے پہ قادر تھی
نئی دُنیا کے آنگن میں فریدالدین کے مرشد کا حجرہ تھا
اور اس حجرے میں وہ محفل بپا تھی، جس میں احمد جام کے مصرعے
شرارے بن کے اُڑتے تھے عجب ذوقِ محبت سے
وہ ایسی آگ تھی، جس آگ میں جل کر حیاتِ جاوِداں میں ڈھل گیا تھا وہ

وہ قطب الدین تھا
دہلی کی رونق اُس سے قائم تھی
وہ دِل کا اِستعارہ تھا
کہانی کے مناظر جو کہ دِل کے اِستعارے کی زمیں میں
کھل رہے تھے، یا کہ دِل کا اِستعارہ اس کہانی کے
مناظر اوڑھ کر چپ چاپ بیٹھا تھا
وہ خوشبو تھا
کہانی تھا
صبا کردار تھا
کیا تھا؟
وہ قطب الدین تھا
دہلی کی رونق اُس سے قائم تھی
وہ دِل کا اِستعارہ تھا
جو خوشبو اوڑھ کر دہلی سے ہانسی اور اجودھن کی طرف
پرواز کرتا جا رہا تھا

اجودھن شہر تھا
شہرِ اجودھن کے گلی کوچوں میں خوشبو رقص کرتی پھر رہی تھی اور
فصیلِ شہر کے باہر ہوا حسنِ معانی کی رِدائیں اوڑھ کر چپ چاپ بیٹھی تھی
خدا جانے کہ کتنے فاصلوں سے پابرہنہ ہو کے اِک کچے سے
حجرے کی زیارت کرنے آئی تھی
اور اس کچے سے حجرے میں فرید الدین تھے
مجلس بپا تھی
اور زمانہ ہاتھ باندھے اس کے چہرے کی زیارت میں مگن تھا
اور نظام الدین اس کی چاکری میں ایستادہ تھے
حریمِ ذات کی خوشبو خیالِ حُسن کے رنگوں کی آمیزش سے
اِک ایسے نئے سُر تال کی بنیاد رکھتی جا رہی تھی جس میں سارے موسموں کی باس شامل تھی
وہ موسم جو کہ اِس حجرے کی خوشبو میں مراقب ہو کے برگ و بار لائے تھے

وہ اِک چھوٹی سی بستی تھی
مگر پھیلاؤ میں اس کے زمانے آ گئے ہیں اور وہ بستی اب
محبت کی علامت ہے

وہ دہلی شہر جو شاہوں کا مسکن تھا

وہ جس کے سب گلی کوچے بقولِ میرؔ اوراقِ مصور تھے
وہ اس کے گرد رقصاں تھا

اجودھن شہر تھا
شہرِ اجودھن میں فریدالدین تھے اور اِک کچا سا حجرہ تھا
جہاں حُسنِ ازل کے موسمِ بے رنگ کے منظر اُترتے تھے
جہاں رنگوں کی بارش تھی
وہ حجرہ نور سے معمور تھا
اس میں فریدالدین کی خوشبو خیال وخواب کے منظر بناتی تھی سجل احساس کے رنگوں سے اور کومل سے جذبوں سے!

اجودھن شہر تھا
شہرِ اجودھن میں زمانہ رقص کرتا پھر رہا تھا
اور اس کو رقص کرتے اِک زمانہ ہو گیا اب تک!
اجودھن ہے
اجودھن میں فریدالدین کا روضہ ہے
اور روضے میں بابِ امن ہے
اس باب کی دہلیز پر سارا تھکا ہارا زمانہ اُترتا ہے

زمانہ رقص کرتا ہے
زمانہ رقص کے عالم میں جب اس باب کی دہلیز سے ہو کر گزرتا ہے،
تو سکھ کا سانس لیتا ہے

وہ خوشبو جو اجودھن کے گلی کوچوں میں رقصاں تھی
نظام الدین کے ہمراہ وہ دہلی شہر کی جانب پلٹ آئی
نظام الدین دہلی میں محبت کی علامت تھا
وہ ایسا صاحبِ دل تھا
کہ اُس کے دل میں دہلی شہر کے سارے مکیں آباد تھے ایسے
کہ جیسے پھول کے آنگن میں خوشبو رقص کرتی ہے
وہ ایسا صاحبِ دِل تھا
کہ شاہوں کو زیارت کی اجازت بھی نہ دیتا تھا ادائے کج کلاہی سے
اگر اُس سے کسی شہ نے اُلجھنے کا کبھی سوچا
کہیں اپنے دلِ ویران کے تاریک گوشے میں
تو پھر اُس کے جلالِ بے نیازی سے وہ بچنے بھی نہیں پایا

’کہ دلّی دُور ہے اب بھی‘ سے ظاہر ہے جلال اُس کا
’ولی اند اختم در گِل‘ بھی اُس کا قولِ فیصل ہے
مگر وہ شہرِ دہلی میں محبت ہی محبت تھا
نظام الدین جب جلوہ نما تھا شہرِ دہلی میں
وہ اپنی ذات میں اِک چاند تھا اور آسمانِ چشت پر اس کی ضیا پھیلی ہوئی تھی
اور ہزاروں قافلے اس کی زیارت کرنے آتے تھے
بدایوں سے
اجودھن اور ہانسی
دیارِ خواجۂ اجمیر سے
بغداد سے
بصرے کی خوش آثار گلیوں سے
وہ مکے اور مدینے سے نجف کے راستے بصرے سے ہوتے خواجگانِ چشت کی بستی سے دہلی شہر کی جانب رواں تھے
اور نظام الدین جلوہ نما تھا شہرِ دہلی میں
نظام الدین: حُسن اور خسروِ شیریں بیاں کا مرشدِ کامل
وہ جس کا چہرۂ انور بقولِ شیخ شیرازی: تماشا گاہِ عالم تھا
وہ جب جلوہ نما تھا شہرِ دہلی میں
وجود اس کا محبت کی علامت تھا
وہ دہلی کا چراغِ جاوِداں مسند نشیں تھا اُس کے حجرے میں
نصیر الدین اُس کا نام تھا
اور محفلیں خیر المجالس تھیں
اور اس کی خوش کلامی کے سبھی موسم ابد آثار تھے اپنے تناظر میں
کمال الدین علامہ بھی اُس کی ریزہ چینی میں بہت خوش تھے
سراج الدین تھے، یا پھر سفر تھا، یا کہانی تھی
اور اب کے اِس کہانی کا سفر گجرات کی جانب رواں تھا
پھر کئی صدیاں کہانی کا سفر گجرات میں برپا رہا تھا
اور وہ اِک گھر تھا کہ جس پر نور کی بارش برستی تھی
وہ اِک گھر ہے کہ جس پر آج بھی انوار کے رنگوں کی بارش ہے
وہ گھر گجرات میں حضرت سراج الدین کا گھر تھا
کہانی جب کئی صدیاں سفر کر کے سراج الدین کے گھر پہنچی، تو پھر صدیوں تلک کچے سے حجرے کے کسی گوشے میں وہ چلہ کشی میں محو رہتی تھی
سراج الدین سے لے کر، مدینے کے مہاجر شیخ یحیٰ تک کہانی اس دیارِ نور سے باہر نہیں نکلی

وہ جب گجرات سے نکلی تو پھر سیدھی مدینے شہر میں پہنچی
طوافِ شہرِ خوش آثار میں رقصاں رہی کتنے ہی برسوں تک
کہ پھر فرمان اس کے کوچ کا آیا
کہ اب جاؤ جہاں آباد دہلی میں رہو
خلقِ خدا کے دُکھ سمیٹو تم
کہانی شہ کلیم اللہ کی صورت اوڑھ کر آئی جہان آباد میں،
اس کے جلو میں اب محبت کی عجب خوشبو ہویدا تھی
جہان آباد کا عامی بھی اس میں سانس لیتا تھا
شہِ دہلی بھی اس خوشبو میں رقصاں تھا
وہ خوشبو چشت کی خوشبو۔۔۔ہزاروں رنگ اس خوشبو سے
پھوٹے تھے
وہ خوشبو اب جہان آباد سے نکلی 'اورنگ آباد' پہنچی۔۔۔اور پھر دہلی پلٹ آئی
وہ خوشبو تھی
کہانی تھی
جہان آباد دہلی تھی
جہاں فخرِ جہاں مسند نشیں تھا اس کے حجرے میں کئی بیدل
اسیرِ زلف تھے، دل ہار بیٹھے تھے
وہ جے پور کے ضیاء الدین تھے
یا خواجہ نورِ محمد تھے مہاراں کے
بریلی شہر کے خواجہ نیاز احمد تھے
یا دہلی کے قمر الدین منت تھے
نظام الملک بھی فتراک میں بسمل پڑے تھے
اور شہِ دہلی بھی شامل تھا غلاموں میں
جہان آباد دہلی میں شہِ فخرِ جہاں مسند نشیں تھا
اور زمانہ اس کے قدموں میں پڑا تھا اور بہت خوش تھا
وہ خوشبو جو جہان آباد سے نکلی 'اورنگ آباد' پہنچی۔۔۔اور پھر دہلی پلٹ آئی
وہ دہلی میں کئی برسوں تلک رقصاں رہی ہر سُو
مگر اب کے اُسے پنجاب جانا تھا
وہ خوشبو اس کہانی کا سراپا اوڑھ کر نکلی جو صدیوں سے سفر کرتی
ہزاروں بستیوں میں گھومتی پھرتی مہراں شہر میں پہنچی،
تو اس شہرِ ابد آثار میں گم ہو گئی تھی وہ

یہ وہ بستی ہے جس کو آسماں جھک کر سلامی دینے آتا ہے
یہ وہ بستی ہے جس پر بامِ مشرق سے اُبھرتا مہرِ رخشندہ اُترتا اور ننگے پاؤں چلتا ہے
وہ اس کی خاک کو مٹھی میں بھر کر اپنی آنکھوں سے لگاتا، چومتا ہے
اور پھر واپس پلٹتا ہے
یہ وہ بستی ہے جس پر چاند: راتوں میں اُداسی اور خاموشی کی بُکل
مار کر آتا ہے اور اس کے گلی کوچوں میں
خوشبو اپنے دامن میں سمو کر رقص کرتا ہے
دھمالیں ڈالتا ہے
اور کبھی انوار کے ہالے بناتا ہے
کبھی وہ خواجۂ نور محمد کے حریمِ ناز میں دھونی رماتا ہے
عجب حُسنِ ارادت سے قدم بوسی کی خوشبو اپنے دامن میں
سمو لیتا ہے اور پھر موسموں کو دان کرتا ہے

کبھی وہ دھیان کے موسم کے باطن میں اُتر کر خواب کی محفل سجاتا ہے
کبھی وہ آگہی کے بادلوں کی اوٹ سے باہر نکل کر چاندنی کو اوڑھ لیتا ہے
کبھی وہ چودھویں شب میں عقیدت کا سراپا اوڑھ لیتا ہے
کبھی چپ چاپ اس کے زاویے میں آ نکلتا ہے
جہاں مجلس بپا ہوتی ہے
اس میں بیٹھ کر وہ خوش کلامی کے کئی منظر سجا لیتا ہے
اپنی چشمِ خوش آثار کے آنگن میں اور پھر
ان سے کتنے موسموں کے خواب بنتا ہے
کبھی خلوت کدے میں آن کر سرگوشیاں کرتا ہے اس سے
اور کبھی وہ نور کی خیرات لیتا ہے
یہ وہ بستی ہے جس پر نور کی برسات ہوتی تھی
یہ وہ بستی ہے جس پر نور کی برسات ہوتی ہے
یہ وہ بستی ہے جس میں علم کی سوغات بٹتی تھی
محبت عام تھی اس کے گلی کوچوں میں اور دن رات بٹتی تھی
یہ وہ بستی ہے جس کو آسماں جھک کر سلامی دینے آتا ہے

وہ تونسہ ہے
جہاں اجمیر دہلی اور اجودھن کے سبھی موسم خیال و خواب کے رنگوں کی تجسیمی فضا میں ڈھل گئے ہیں اور وہ خوش آثار بستی ہے
کہ جس کے سب گلی کوچے مہاراں شہر کی مہکار کی

ایسی علامت بن گئے ہیں
جو کہ اپنی اِک کہانی لکھ رہی ہے اور کہانی جس کا پس منظر ابد کے طاق پر رکھے
دیے کے نور سے روشن ہے اور اس کی ضیا ساری کہانی کے مناظر کو اجودھن اور مہاراں
کی زمیں سے جوڑ کر
لکھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
کہانی جو تحیر کا سراپا اوڑھ کر حُسنِ عقیدت کے طلسماتی جہاں میں
طاق کے اوپر دھری ہے اور ابد کے طاق پر رکھے دیے کی لو مسلسل بڑھ رہی ہے
اور زمانہ دیکھتا جاتا ہے حیرانی کے موسم میں!

وہ تونسہ ہے
جہاں طاقِ ابد پر خواجگانِ چشت نے اپنا چراغ جاوِداں
روشن کیا ہے یہ چراغِ جاوِداں صدیوں سے اِک ایسی کہانی لکھ رہا ہے
اب جسے وہ جاوِدانی لکھ رہا ہے نور کی خوشبو سے اور احساس کے رنگوں کے موسم میں

وہ تونسہ ہے
جہاں اجمیر، دہلی اور اجودھن کے سبھی خوش رنگ موسم
ایک تجسیمی فضا کا اِستعارہ بن گئے ہیں
اور وہاں شہرِ مہاراں کا تمدن خواب رنگوں میں مجسم ہو گیا ہے
اور زمانہ دیکھتا جاتا ہے اور حیرت زدہ بھی ہے
وہ تونسہ ہے
ابد کے طاق پر رکھے دیے کی لو مسلسل بڑھ رہی ہے
اور زمانہ دیکھتا جاتا ہے حیرانی کے موسم میں!
زمانے کا سفر شہرِ ابد کی سمت جاری ہے
اور اب کے یہ سفر تونسے سے دہلی اور اجودھن اور مہاراں سے
دیارِ خواجۂ اجمیر کی جانب رواں ہے
اور زمانہ دیکھتا جاتا ہے
اور حیرت زدہ بھی ہے

کہانی جو کہ مکے اور مدینے اور نجف کے راستے کتنے زمانوں کا
سفر کرتی ہزاروں بستیوں میں گھومتی پھرتی
دیارِ شمس دیں میں آن اُتری تھی
کہانی کے جلو میں خواب تھے حُسنِ تمنّا کے
یہ دو وصدیوں کا قصہ ہے

مگر اس میں کئی صدیوں کی خوشبو سانس لیتی ہے
یہ قصہ اُس کہانی کے طلسماتی اُفق کا ایک حصہ ہے
جو صدیوں سے ابد کے طاق پر رکھی ہوئی دستِ ہنرور کی
کرامت کا عجب منظر بناتی ہے

یہ دو صدیوں کا قصہ ہے
کہ اس بستی نے مغرب کی طرف اپنے سفر کی ابتدا کی تھی
وہ دریا کے کنارے چل کے تونسہ شہر میں پہنچی تھی
اور اپنی جبینِ شوق کو اُس سرزمیں پر رکھ دیا تھا
پھر ابد کے طاق پر رکھے چراغِ چشتیاں کے نور سے معمور
جب واپس وہ پلٹی تھی
تو پھر اس کے جلو میں اِک زمانہ رقص کرتا آ رہا تھا
ہر طرف مہکار تھی اس کی
وہ بستی تھی سیالوں کی
جو تونسے کے ابد آباد اور شاداب موسم میں مراقب تھی

یہ دو صدیوں کا قصہ ہے
اور اِس قصے کے سارے منظروں میں ایک خوشبو ہے
اور اس خوشبو کے سارے رنگ اُس موسم سے پھوٹے ہیں
وہ موسم جو کہ تونسے میں ابد کے طاق پر رکھا ہوا ہے
اور اس میں تازگی کے سب قرینے جاگ اُٹھے ہیں
وہ شادابی کہ جو اس شہر سے پھوٹی، کئی رنگوں میں بکھری اور زمانے بھر کو مہکاتی ہوئی شہرِ محبت میں اُتر آئی
وہ جس شہرِ محبت میں اُتر آئی

وہ شہر گولڑہ ہے اور محبت کی علامت ہے، وہ خوشبو کا نگر ہے
اور خیال و خواب کے موسم اسی شہرِ محبت کی
ہواؤں سے معطر ہیں
اور اس شہرِ محبت میں محبت رقص کرتی ہے
محبت خواب ہے
اور خواب کے موسم میں برگ و بار لاتی ہے
کبھی وہ خواب کے آنگن میں تجسیمی رِدائیں اوڑھ لیتی ہے
کبھی وہ خواب کی خود خواب میں تجسیم کرتی ہے

کبھی تجسیم کے موسم میں پھیلی اُس کہانی کے مناظر اِک نئے
اسلوب کی خوشبو میں لکھتی ہے
کبھی ایسی کہانی کا سراپا اوڑھ لیتی ہے
کہانی: جو کہ صدیوں سے سفر کرتی ہزاروں بستیوں میں گھومتی پھرتی
دیارِ خواجۂ اجمیر میں آ کر سکوں کا سانس لیتی ہے
کبھی دہلی سے ہانسی اور اجودھن جا نکلتی ہے
تو اِن صدیوں کے سارے منظروں کا پیش نامہ
ایک ہی موسم کے رنگوں کی علامت بن کے
ڈھل جاتا ہے اِک ایسی کہانی میں
کہانی جو کہ مکے اور مدینے اور نجف کی خاک میں اُگتی ہے
اور ان شہروں کی خوشبو سے مہکتی آ رہی ہے
کتنی صدیوں کا سفر کر کے

یہ اِک چھوٹے سے بچے کی کہانی ہے
وہ بچہ خود کہانی ہے
وہ بچہ اِک سفر ہے اور کہانی اس سفر کا اِستعارہ ہے

وہ بچہ ایک پسماندہ سے گاؤں کے کسی کچے سے گھر میں اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے رو رہا تھا
اور کہانی ایک پسماندہ سے گاؤں کے کسی کچے سے گھر سے پابرہنہ ہو کے نکلی تھی
اُسے اس سرزمیں کی خاک پر اپنی جبینِ شوق دھرنی تھی
جسے حُسنِ ازل نے اس کی قسمت کر دیا تھا
اب سفر اور یہ کہانی لازم و ملزوم ہیں شاید
کہانی اس سفر کا اِستعارہ ہے
سفر اب اس کہانی کی علامت ہے
یہ اِک چھوٹے سے بچے کی کہانی ہے

وہ بچہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے اس دیارِ نور میں گم سم کھڑا تھا
اور کہانی اِک نئے موسم کی خوشبو سے مہکتی جا رہی تھی
پھر اچانک نور اور خوشبو مجسم ہو کے اُس لمحے کو روشن کر رہے تھے جس میں وہ بچہ ـــــ!
وہ بچہ جو کہ ماں کا ہاتھ پکڑے رو رہا تھا اور اسی عالم میں
اِک خوشبو نے اس روتے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ رکھا تھا عجب حُسنِ محبت سے
وہ بچہ آج بھی اُس لمس کو محسوس کرتا ہے

●●●

ڈاکٹر طارق ہاشمی

ابد کے طاق پہ رکھے ہوئے چراغ ـــــ تجزیاتی مطالعہ

اُردو نظم کے سرمائے میں بعض تخلیقات ایک بالکل مختلف موضوع اور مزاج رکھتی ہیں۔ مثلاً اقبال کی نظم ''بلادِ اسلامیہ'' جس میں اُن شہروں کو موضوع بنایا گیا ہے جو اسلامی تہذیب کا گہوارہ رہے ہیں لیکن اقبال نے ایسے دیاروں پر قلم اُٹھایا ہے جو اسلامی فرماں رواؤں نے فتح کیے اور پھر وہ ایک عرصے تک ثقافتِ اسلامی کی روشنی سے منوّر رہے اور بعض خطے آج بھی اُس کی تابانی سے جگمگا رہے ہیں۔ جعفر طاہر نے ''ہفت کشور'' کے عنوان سے کینٹوز رقم کیے، جن میں اقبال کی بلادِ اسلامیہ کی توسیع ممالکِ اسلامیہ کی تحسین کی صورت میں کی۔

مذکورہ مثالوں میں عالمِ اسلام کے جغرافیائی خدوخال اور تمدنی آثار کے ترانے نظم کیے گئے ہیں۔ اِس تخلیقی سرمائے کا ایک اور رُخ جس میں تاریخ کو نظم کرنے کی ایک سعی کی گئی ہے۔ حالی کی ''مسدس مدو جزر اسلام'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے جو ہماری قومی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اِسی طرح ایک اور کوشش حفیظ جالندھری کا ''شاہ نامہ'' ہے، اگرچہ اِس میں تاریخ زیادہ اور شاعری کم ہے۔ گزشتہ دنوں نجیب احمد کی طویل نظم ''ازل'' کا مطالعہ کیا، جس میں تاریخِ نبوت کو منظوم کیا گیا ہے اور اُس میں حضرتِ آدمؑ سے رسولِ کریم ﷺ تک معروف و معتبر انبیائے کرام کی رُوحانی اور فلاحی کاوِشوں کی تحسین کی گئی ہے۔ اس نظم میں رسولانِ پاک کی تعلیمات کا بھی ایمائی پیرائے میں تذکرہ اور خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

اِس نوع کی ایک اور بہت ہی منفرد تخلیق ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر کی طویل نظم ''ابد کے طاق پہ رکھے ہوئے چراغ ہے'' جس میں سلسلۂ چشتیہ کے صوفیائے کرام، اُن کے احوال اور تعلیمات کو ایک تخلیقی شعری پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اِن اولیائے عظام کا سلسلۂ نسب کہاں سے آغاز پذیر ہوتا ہے، کن کن دیاروں میں اِن مقدس ہستیوں نے چراغِ رُوحانی روشن کیے، خوشبو کی اِس ہجرت نے کن کن خطوں کو مہکایا اور گلستانِ انسانی سے خزاں آثار لمحوں کو معدوم کر کے بہار نشاں

آنات کو کس طرح تاباں کیا یہ وہ کہانی ہے جو اِس نظم میں ایک عجیب تخلیقی اسلوب میں بیان کا پیراہن زیب تن کرتی ہے۔ نظم کی اِبتدا یوں ہے:

بدن کی خانقاہوں میں ریاضت کے کئی موسم
سرِ شاخِ تمنّا جب مہکتے ہیں دُعا بن کر
تو اُن کی باس رنگوں کی اَنا کے زاویے تبدیل کرتی ہے
نئی تشکیل کرتی ہے

نئی تشکیل کرتی ہے اِک ایسے خیمۂ جاں کی
جہاں بھیگی ہوئی راتیں صحیفے لے کے اُتری ہوں
جہاں خوشبو عقیدت سے نئے منظر بناتی ہو
جہاں موسم وجودِ ذات کا اثبات کرتے ہوں
جہاں کثرت کے پردوں میں بس اِک منظر اُبھرتا ہو
وہی منظر حقیقت ہے

نظم کا یہ ابتدائیہ بھی ہے اور اُس کا فکری ماحصل بھی۔ رُوحانی تعلیمات انسان کے باطن کو کس طرح پاکیزہ کرتی ہیں۔ انسان کی ماہیتِ قلب اور تزئینِ صدر کے لیے رُوحانی ہستیاں کیسا طلسماتی کردار ادا کرتی ہیں اور انسان کثرتِ اشیا سے گریز کرتے ہوئے کس طرح ایک اکائی کی طرف رجوع کر کے حقیقت آشنا ہوتا ہے اِن تمام فکری پہلوؤں کو تخلیق کار نے ایک عمدہ فن کارانہ شعور کے ساتھ سمیٹا ہے۔ ابتدائیے کا یہ متن بعثتِ رسولِ کریم ﷺ سے قبل وقت کی اُن گردشوں کی تمثال بھی ہے، جس میں زمانہ کذب وریا سے گریز کرتے ہوئے ایک عظیم حقیقت کی طرف رجوع کر رہا تھا اور انسان کو کرۂ ارض کے وسیع وعریض جغرافیے میں ایک ایسا خطۂ رُوحانی میسر آ رہا تھا جو نور ونکہت کا مرکز تھا اور انسان کو اُسی روشنی اور خوشبو سے اپنے حواس کو منوّر ومعطر کر کے تہذیبی رفعت کو مس کرنا تھا اور حقیقی معنوں میں احسنِ تقویم بننا تھا۔

اگلے بند سے نظم کا معنوی پیرایہ قاری کو اُس فکری جہت کی طرف لے جاتا ہے، جو اِس کا موضوعِ اصل ہے۔ شاعر شہرِ مدینہ کی توصیف میں سر، پلکیں اور خامہ جھکا کر آگے بڑھتا ہے:

مدینہ ایسی بستی ہے کہ جس کے سامنے سارے زمانے ہاتھ باندھے سرنگوں ہیں
اِس دیارِ نور کے آگے یہ ساتوں آسماں اپنی غلامی کے مقر ہیں
اور اِس شہرِ تمنّا کا طوافِ جاوِداں اِن کا مقدر ہو گیا ہے

رُوحانیت کا جو ورثہ شہرِ مدینہ سے تعلق رکھتا ہے اُس کا تسلسل خطۂ نجف کی صورت میں آثار پذیر ہوا، اور حضرتِ علیؓ ایسے پیکرِ علم وشجاعت نے اپنی بصارت وبصیرت کے باعث نجف کی

سرزمین کو تاریخِ رُوحانی میں ابد نشاں بنا دیا۔نظم آگے بڑھتی ہے اور سلسلۂ رُوحانی کے اس نشانِ منوّر کی تحسین کرتی ہے جس نے بصرے میں چراغ روشن کیے:

وہ خوشبو جو مدینے سے نجف کے راستے بصرے میں پہنچی تھی،
حسن بصری کے آنگن کے کسی گوشے میں تنہائی کی
صورت اوڑھ کر حُسنِ عقیدت کے عجب منظر کی تخلیقی فضا میں ڈھل گئی تھی وہ
وہ خوشبو اِک کہانی لکھ رہی تھی
اِس کہانی کے سبھی منظر مدینے شہر کے رنگوں کی خوشبو کا سراپا اوڑھ کر حُسنِ تمنّا کی نئی تعبیر لکھتے جا رہے تھے

یہاں شاعر نے اُن فروعی اختلافات کو اہم نہیں گردانا جو ہندوستان آمد سے قبل سلسلۂ چشت کے جدِامجد سے متعلق ہیں اور نہ نظم میں اِن کی گنجائش تھی۔شاعر نے حضرتِ حسن بصریؒ کو کہانی کے اُس ہرے موسم سے تعبیر کیا ہے جس کی خوشبو اور خنکی کا مصدر گنبدِ سبز ہے۔ یہاں نظم کا تسلسل اُس پڑاؤ پہ بھی ہے جہاں سلسلۂ چشت کی یہ کہانی سرزمینِ حجاز سے سفر کرتی ہوئی خطۂ ہندوستان میں داخل ہوتی ہے اور دیارِ اجمیر اُس کا مرکز ٹھہرتا ہے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری ہندوستان میں سلسلۂ چشت کے بانی اور تصوفِ اسلامی کی برگزیدہ ترین ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔وہ التتمش کے زمانے میں دہلی آئے مگر اپنے آپ کو سیاسی قوت سے دُور رکھنا ہی مناسب سمجھا اور سروں پر حکومت کے بجائے دلوں پر راج کو ترجیح دی۔ آپ کی تعلیمات میں دُکھی انسانیت کی خدمت کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔''سیر الاولیا'' اور ''فوائد الفواد'' میں درج آپ کے ارشادات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آپ کس قدر دلِ دردمند رکھتے تھے۔

سلسلۂ چشت کا فیضان پورے ہندوستان میں پھیلا اور اس سے وابستہ رُوحانی ہستیوں نے انسان کے باطن کو نورِ ہدایت سے روشن کرنے کا کارِ عظیم انجام دیا۔ یہ بزرگانِ دین خود کو حکومتی رسم و راہ سے دُور رکھتے تھے اور اپنے مریدوں کو بھی اِس سے گریز کی تعلیم دیتے تھے۔ اِن کے نزدیک مقلد اور جرأت ناپسندیدہ لوگ تھے۔مقلد سے مراد وہ لوگ ہیں جو بے مرشدے ہوں اور کہیں سے ہدایت نہ پائی ہو جب کہ جرأت سے مراد ایسے لوگ ہیں بادشاہوں، امراء اور اہلِ ثروت سے دولت کی طلب رکھتے ہوں۔تاریخ میں کئی ایک ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ سلسلۂ چشت کے بزرگوں کو پیشکش ہوئیں مگر انھوں نے قبول نہ کیں اور اہلِ دربار سے کوئی لالچ نہ رکھا۔نظم میں تعلیمات کے بیان کی گنجائش کم ہوتی ہیں تاہم اُن کی جانب ایمائی اِشارے ضرور کیے جا سکتے ہیں

اور ''ابد کے طاق پہ رکھے چراغ''، میں اِسی اسلوب کو ترجیح دی گئی ہے:

وہ ایسا صاحبِ دل تھا
کہ اُس کے دل میں دہلی شہر کے سارے مکیں آباد تھے ایسے
کہ جیسے پھول کے آنگن میں خوشبو رقص کرتی ہے
وہ ایسا صاحبِ دِل تھا
کہ شاہوں کو زیارت کی اجازت بھی نہ دیتا تھا ادائے کج کلاہی سے
اگر اُس سے کسی شہ نے اُلجھنے کا کبھی سوچا
کہیں اپنے دلِ ویران کے تاریک گوشے میں
تو پھر اُس کے جلالِ بے نیازی سے وہ بچنے بھی نہیں پایا
'کہ دلّی دُور ہے اب بھی' سے ظاہر ہے جلال اُس کا
'ولی انداختم در گِل' بھی اُس کا قولِ فیصل ہے
مگر وہ شہرِ دہلی میں محبت ہی محبت تھا

نظم میں وہ تمام نقشہ پورا واضح ہے کہ سلسلۂ چشت کے بزرگان نے کس کس مقام کو مرکزِ ہدایت بنایا۔ کس کس خطے میں ہجرت کی اور کہاں سے کب مراجعت اختیار کی، مگر یہ ساری داستان عبدالعزیز ساحر نے تاریخ کے بجائے شاعری کے رُوپ میں بیان کی ہے۔ اِس سلسلے کے وابستہ بزرگانِ رُوحانی حضرت فریدالدینؒ، حضرت قطب الدینؒ، حضرت سراج الدینؒ، حضرت قمرالدینؒ کے علاوہ جے پور کے حضرت ضیاء الدینؒ، مہاراں شریف کے حضرت خواجہ نور محمدؒ، بریلی کے خواجہ نیاز احمدؒ، تونسہ شریف کے خواجہ سلیمانؒ، سیال شریف کے خواجہ شمس الدینؒ اور گولڑہ شریف کے مہر علی شاہؒ کا ذِکر ایک زمانی ترتیب سے ارادت مندانہ اسلوب میں کیا گیا ہے اور اِن خواجگان نے جن جن خطوں کو اپنا مرکزِ ہدایت بنایا، اُن کا ذِکر بھی عقیدت بھرے پیرائے میں کیا گیا ہے:

یہ وہ بستی ہے جس کو آسماں جھک کر سلامی دینے آتا ہے
یہ وہ بستی ہے جس پر بامِ مشرق سے اُبھرتا مہرِ رخشندہ اُترتا اور ننگے پاؤں چلتا ہے
وہ اس کی خاک مٹھی میں بھر کر اپنی آنکھوں سے لگاتا، چومتا ہے
اور پھر واپس پلٹتا ہے
یہ وہ بستی ہے جس پر چاند: راتوں میں اُداسی اور خاموشی کی بُکل
مار کر آتا ہے اور اس کے گلی کوچوں میں
خوشبو اپنے دامن میں سمو کر رقص کرتا ہے
دھمالیں ڈالتا ہے

اور کبھی انوار کے ہالے بناتا ہے
کبھی وہ خواجۂ نور محمد کے حریمِ ناز میں دھونی رماتا ہے
عجب حُسنِ ارادت سے قدم بوسی کی خوشبو اپنے دامن میں
سمو لیتا ہے اور پھر موسموں کو دان کرتا ہے

''ابد کے طاق پہ رکھے چراغ'' کی فکری خاصیت یہ ہے کہ شاعر نے جن ہستیوں کا ذِکر کیا ہے، وہ فکرِ دُنیا اور ہوسِ زر سے تو آزاد تھے ہی مگر وقت کے ریاضیاتی دائرے کے بھی اسیر نہ تھے۔ وہ آنات کے اُس سلسلے سے وابستہ تھے کہ وقت کا ریاضیاتی نظام اُس کے تابع تھا۔ موسموں کی تبدیلی کا عمل اُس کے اِشاروں کا مرہونِ منت تھا بلکہ موسموں کا ردّ و بدل اور جوبن کا منبع فیض بھی وہی تھا۔ اِن چراغوں کو زمانے کی کوئی ہوا بھی اِسی لیے نہ بجھا سکی کہ یہ اَبد کے طاق پہ رکھے ہوئے ہیں اور وہ جو کہا گیا ہے تو سچ ہی کہا گیا ہے کہ:

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

کہانی کے پیرائے میں تخلیق کی گئی اِس نظم میں تسلسل ایک جوئے خوش آب کی طرح ہے جس میں سفر، خوشبو اور موسم کے استعاروں کی تاب دار موجیں ایک طلائی قوس کی طرح اُبھرتی ہیں۔ نظم میں روایت کی معنویت کو تاریخ کے ایک رُوحانی اور طلسماتی دھارے کے ساتھ جوڑ کر ایک دلکش پیرائے میں اُس کی پرتیں کھولی گئی ہیں، مجھ گنہ گار نے ''سیر الاولیا'' اور ''سیر العارفین'' کا مطالعہ تو نہیں کیا لیکن یہ نظم اِن تذکروں کا ایک اجمالی شعری عکس ضرور ہے کہ جن میں چشتی اولیائے عظام کی سیرت وکردار کی خوشبو کو اِس طرح یک جا کیا گیا ہے کہ جیسے نافِ غزال میں کستوری کی مہک سمٹی ہو۔

نظم کے اختتام پر ایک یتیم بچے کا کردار اُبھرتا ہے مگر یہ محض کردار نہیں بلکہ خود کہانی ہے اور اُوپر بیان کی گئی داستان کی رُوحِ رواں بھی۔ نظم کی اِبتدا ذکرِ مدینہ سے ہوتی ہے اور اختتام ایک یتیم بچے کے کردار کے تذکرے پر۔۔۔ یقیناً اہلِ فہم اُس دائرے کو سمجھ سکتے ہیں جو آغاز سے اختتام تک نظم میں صدیوں پر محیط فکری کہانی کو سمیٹتا ہے۔

''ابد کے طاق پہ رکھے چراغ'' میں عبدالعزیز ساحر کا تخلیقی رنگ جس آہنگ میں ظاہر ہوا ہے، وہ حیرت افزا ہے اور مذہب، تصوف اور تاریخ کو اِس نظم میں جن محسناتِ شعری سے مزین کر کے پیش کیا گیا ہے اُس کی انفرادیت کی تحسین کا حق بھی لفظ کے بجائے حیرت کی فراوانی ہی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔

بیدل حیدری

٭

کمتر نہیں ہے زہر سے یکسانیت مجھے
تنہائی نے ڈسا ہے تو آئی ہے مت مجھے
میں دھوپ کے سفر میں نہ ٹھہرا نہ دَم لیا
رستے میں یوں تو پیڑ ملے اَن گنت مجھے
بارش میں لے کے جاؤں کہاں خستہ جسم کو
گھر سے نہ یوں نکال مرے گھر کی چھت مجھے
لازم نہیں کہ نام کی تختی لگائی جائے
سب لوگ جانتے ہیں تری معرفت مجھے
کالی دوات کون اُنڈیلے فصیل پر
منظور ہی نہیں ہے لہو کی بچت مجھے
میلا لباس جتنا ہے، لفظ اتنے خوشنما
جذبوں کی آگہی ہے یہ اچھی بنت مجھے
پی۔آر شپ کے تابعِ فرماں ہے شاعری
ملکِ سخن کی کیسے ملے سلطنت مجھے
کافر تھا کس قدر مرے اندر کا آدمی
لکھ کر سُنا گیا جو مری منقبت مجھے
بیدلؔ نہ ٹافیاں نہ کھلونے تھے ہاتھ میں
بچے سے شام کرنی پڑی معذرت مجھے

●●●

تصویر پانیوں کی کچھ ایسی بنائی جائے
حدِ نظر تک آگ بھڑکتی دِکھائی جائے
آنسو بھی سیر کے لیے آتے ہیں آنکھ میں
یہ آبجو بھی بارہ دری سے ملائی جائے
اس نے طلب کیا ہے سرِدست معجزہ
سورج کی ہر کرن مِری مٹھی میں لائی جائے
دھوکہ دہی سے اب کے برس بھی خریدا سے
جعلی کرنسی اب کے برس بھی چلائی جائے
وہ شخص نرم دل ہے تو پھر دیر کس لیے
کچی زمیں پہ پختہ حویلی بنائی جائے
میری قد آوری کی خبر پھر سے گرم ہے
بالشتیوں کی پھر کوئی مجلس بلائی جائے
ہے اس کی جنگ مجھ سے مرے بھائی سے نہیں
بیدلؔ محاذِ جنگ پہ کیوں میرا بھائی جائے

●●●

کیا کریں گے قتل یہ ظلمت کے بیوپاری مجھے — ان اندھیروں میں بھی آتی ہے سحر کاری مجھے
ریزہ ریزہ ہو کے بکھرا ہے خلاؤں میں بدن — کس قدر مہنگی پڑی ہے چاند کی یاری مجھے
دستکیں بھی بند ہیں پتھر بھی آنے بند ہیں — کاٹتی ہے اب تو گھر کی چار دیواری مجھے
میں نے غربت کے سبب ساری کتابیں بیچ دیں — کوستی رہتی ہے اب کمرے کی الماری مجھے
مجھ دبے کچلے ہوئے انسان کی وقعت ہی کیا — تو نے ناحق ذہن پر کیوں کر لیا طاری مجھے
فن کی قلمیں کس بیاباں میں لگانی پڑ گئیں — کس جگہ کرنی پڑیں آ کر شجر کاری مجھے

اس کو پا لینا کوئی آساں نہ تھا بیدلؔ مگر
اس کو پا کر بھی سفر رکھنا پڑا جاری مجھے

•••

وہ اتنا سادہ ہے ظالم کہ کچھ پتہ نہ لگے — جفا کرے بھی تو ایسے کہ بے وفا نہ لگے
وہ جس پہ ترکِ وفا کا گمان تک بھی نہ تھا — بدل گیا ہے کچھ ایسا کہ آشنا نہ لگے
عجیب بات ہے اِک شخص کے نہ ہونے سے — مرا ہی گھر ہے مگر مجھ کو قید خانہ لگے
کھڑا ہو وہ بھی مرے ساتھ ہی کٹہرے میں — مگر کہاں وہ عدالت کہ منصفانہ لگے
مجھے جو روک رہے ہو تم اس کی پوجا سے — اسی سے کیوں نہیں کہتے کہ دیوتا نہ لگے
تری شعاعِ بدن سے نظر جھلستی ہے — ترے گلے سے کوئی کیسے والہانہ لگے

یہ تپتی ریت یہ خیمے یہ سسکیاں بیدلؔ
مجھے تو یہ کسی مظلوم کا گھرانہ لگے

•••

حال اپنا کبھی اس سے زبانی نہ کہا کر — لفظوں کے سہارے یہ کہانی نہ کہا کر
تجھ کو تو خبر ہے مرے احوالِ ہنر کی — تو تو مری غزلوں کو پُرانی نہ کہا کر
جب پیاس کا صحرا تجھے صحرا نہیں لگتا — پھر آنکھ کے پانی کو بھی پانی نہ کہا کر
مفلس کی جوانی تو جوانی نہیں ہوتی — مفلس کی جوانی کو جوانی نہ کہا کر
یہ خانہ بدوشی مری قسمت میں لکھی ہے — ہجرت کو مری نقل مکانی نہ کہا کر

لوگ آگ لگا دیں گے ترے گھر کو بھی بیدلؔ
تاریک گھروندوں کی کہانی نہ کہا کر

•••

آصف شفیع

*

دیکھ مت دل کی طرف اتنی فراوانی سے — یہ کبھی دام میں آتا نہیں آسانی سے
آج کل اوج پہ ہے حالتِ وحشت اپنی — اور کیا پوچھتے ہو درد کے زندانی سے
بابِ حیرت کبھی کھلتا نہیں آئینے پر — تنگ دامان و تہی دست ہے عریانی سے
میں تری چشمِ فسوں ساز میں اُلجھا ایسا — آج تک لوٹ کر آیا نہیں حیرانی سے
اپنے ہمراہ کہاں زادِ سفر رکھتے ہیں — جو محبت کی طرف آئے ہوں نادانی سے

محفلِ عیش وطرب میں بھی گیا ہوں آصفؔ
دل کو تسکین ملی دشت کی ویرانی سے

•••

آبدیدہ تھا جو میں بے سر و سامانی پر — محوِ حیرت ہوں محبت کی فراونی پر
تجھ سے بیگانۂ احساسِ الم کیا جانیں — کیا گزرتی ہے شب و روز کے زندانی پر
چشمِ نم سے کہاں ممکن ہے نظارا دل کا — نقش بنتا ہی نہیں بہتے ہوئے پانی پر
حُسنِ جاں سوز کو جب شعر میں ڈھالا میں نے — لوگ حیران ہوئے میری سخن دانی پر
وہی اندازِ عمل داری بھی سکھلائے گا — جس نے مامور کیا مجھ کو جہاں بانی پر

میرا ہر خواب تہِ خاک پڑا ہے آصفؔ
نوحہ کس طرح لکھوں شہر کی ویرانی پر

•••

عمر ساری تری چاہت میں بِتانی پڑ جائے — یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آگ بجھانی پڑ جائے
میری اس خانہ بدوشی کا سبب پوچھتے ہو — اپنی دیوار اگر تم کو گرانی پڑ جائے!
میرے اعدا سے کہو، حد سے تجاوز نہ کریں — یہ نہ ہو مجھ کو بھی شمشیر اٹھانی پڑ جائے
کیا تماشا ہوٗ اگر منصفِ اعلیٰ کو بھی — درِ انصاف کی زنجیر ہلانی پڑ جائے

کاش پھر مجھ سے وہ پوچھیں مری وحشت کا سبب کاش پھر مجھ کو وہ تصویر دکھائی پڑ جائے
دشت سے شہر میں کچھ سوچ کے آنا آصفؔ زندگی بھر کی ریاضت پہ نہ پانی پڑ جائے

•••

جہانِ حسن و نظر سے کنارہ کرنا ہے وجودِ شب کو مجھے استعارہ کرنا ہے
مرے دریچۂ دل میں ٹھہر نہ جائے کہیں وہ ایک خواب کہ جس کو ستارہ کرنا ہے
تمام شہر اندھیروں میں ڈوب جائے گا ہوا کو ایک ہی اس نے اشارہ کرنا ہے
یہ قربتوں کے ہیں لمحے، انھیں غنیمت جان انہی دنوں کو تو ہم نے پکارا کرنا ہے
وہ دوستوں کو بتائے گا پیار کا قصہ اور اس نے ذکر بہت کم ہمارا کرنا ہے

مری نگاہ میں جچتا نہیں کوئی آصفؔ
سو اس کے قرب کو حاصل دوبارہ کرنا ہے

•••

یہ معجزہ بھی کسی روز کر ہی جانا ہے ترے خیال سے اک دن گزر ہی جانا ہے
نہ جانے کس لیے لمحوں کا بوجھ ڈھوتے ہیں یہ جانتے ہیں کہ اک دن تو مر ہی جانا ہے
بہت حسین ہے تو بھی اے پھول سی خواہش ہوا کے ساتھ تجھے بھی بکھر ہی جانا ہے
وہ کہہ رہا تھا نبھائے گا پیار کا وعدہ میں جانتا تھا کہ اس نے مکر ہی جانا ہے
ہوائے شام! کہاں لے چلی زمانے کو ذرا ٹھہر، کہ ہمیں بھی اُدھر ہی جانا ہے

میں خواب دیکھتا ہوں اور شعر کہتا ہوں
ہنروروں نے اسے بھی ہنر ہی جانا ہے

•••

کھلے ہیں عشق و محبت کے باب میرے لیے پہن رہا ہے یہیں کوئی خواب میرے لیے
میں کیسے کہہ دوں اسے کچھ نہیں ہے پاسِ وفا جو بھیجتا ہے مہکتے گلاب میرے لیے
مجھے خبر ہے کہ نفرت کے آسمانوں سے اُتر رہے ہیں بہت سے عذاب میرے لیے
میں دشتِ عشق میں خوار و زبوں نہیں تنہا ہوا ہے حسن بھی خانہ خراب میرے لیے
انہی پہ حیرت و حسرت تمام ہوتی ہے سفر سفر جو پڑے ہیں سراب میرے لیے

فسوں گری کا بھرم آصفؔ اس کو رکھنا ہے
جو لکھ رہا ہے وفا کی کتاب میرے لیے

•••

آصفہ نشاط

✲

تمہیں مجھ سے محبت ہے نہیں تو
مُکر جانے کی عادت ہے نہیں تو

سنانا چاہتے ہیں حالِ دل ہم
تمہیں تھوڑی سی فرصت ہے نہیں تو

ہماری بھول ہو تو ہم سے کہہ دو
یا بس یونہی عداوت ہے نہیں تو

ذرا سے بے تکلف تو ہوا ہے
اضافے کی بھی صورت ہے نہیں تو

ڈرائیں گے اسے خوفِ خدا سے
یا کوئی اور صورت ہے نہیں تو

بہت سے اور بھی ہوں گے ہمیں کیا
وہی اِک خوبصورت ہے نہیں تو

چلی تو آئی ہو تم آصفؔہ جی
تمہاری کوئی عزت ہے نہیں تو

●●●

آفتاب احمد

٭

ممکن نہیں کہ ہو مری تمثال اور بس
آئینہ دیکھتا ہے خدوخال اور بس

کردار ہو رہے ہیں الاؤ کی نذر ، اب
بجھنے کو ہے جمی ہوئی چوپال اور بس

یعنی کوئی بھی صورتِ احوال اب نہیں
یعنی یہی ہے صورتِ احوال اور بس

صیّاد ! قدغنیں کہاں لگتی ہیں سوچ پر
کاٹو گے تم بھی صرف پر و بال اور بس

اِک کوزہ گر کے ہاتھ ہی لگنے کی دیر تھی
مٹّی کو ، مِل گئیں ، مری اشکال اور بس

اب اس قدر بھی پختہ نہیں جسم کا مکاں
سانسوں کا ایک آخری بھونچال اور بس

جینے کا ایک پل بھی میسر نہیں مجھے
چہرے پہ ہے یہ گردِ مہ و سال اور بس

کب شعر بھیجتا ہوں ہواؤں کے ہاتھ میں
کرتا ہوں اپنے خواب ہی ارسال اور بس

تم آفتاؔب ملنے لگے ہو تپاک سے
تم بھی چلو گے مجھ سے کوئی چال اور بس

•••

ہر طرف کیوں ہے اژدہام مرا
نام تھا جب برائے نام مرا

اپنی تعمیر کر رہا تھا میں
لوگ سمجھے تھے انہدام مرا

رات دریا سے خوب باتیں کیں
رات پانی پہ تھا قیام مرا

میں نے دیوار و در کے دُکھ بانٹے
خامشی نے سنا کلام مرا

اِتنا مصروف تھا خبر نہ ہوئی
باقی رہتا ہے کتنا کام مرا

میرے حاسد ، ترا حسد تجھ سے
روز لیتا ہے انتقام مرا

میری دُشمن تھی خودسری احمؔد
عاجزی سے بڑھا مقام مرا

•••

تمام زندگی ردّ و قبول ہونے کے بعد ۔۔۔ مِلا ہے راستہ، رستوں کی دھول ہونے کے بعد
خوشی یونہی تو مجھے راس آنے والی نہ تھی ۔۔۔ یہ ذائقہ تو چکھا ہے ملول ہونے کے بعد
مِری اصول پسندی مری سرشت نہ تھی ۔۔۔ یہ میں نے سیکھی ہے خود بے اصول ہونے کے بعد
مِری حیات مجھے کچھ خبر تو دے ، تجھ کو ۔۔۔ کہاں پہ خرچ ہوا ہوں، وصول ہونے کے بعد
اُتر رہا ہوں ابھی آیتوں کی صورت میں ۔۔۔ سمجھ میں آؤں گا پورا نزول ہونے کے بعد
زمیں پہ رہ کے بشر کس طرح خطا نہ کرے ۔۔۔ زمیں ملی ہو جسے ایک بھول ہونے کے بعد
کُھلا یہ مجھ پہ کہ میں کتنا کارآمد ہوں ۔۔۔ خود اپنی نظروں میں احمدؔ فضول ہونے کے بعد

•••

بس اِتنی بات نے سب کو مرے خلاف کیا ۔۔۔ اِک آئنے پہ لگا زنگ میں نے صاف کیا
عجب طرح کی ہے مجھ سے مخاصمت میری ۔۔۔ اُسی کا ساتھ دیا جس سے اختلاف کیا
خبر نہیں تھی ترا اصل گھر کہاں پر ہے ۔۔۔ سو ہم نے دَیر کبھی دشت کا طواف کیا
مجھے بھروسہ ہی اتنا تھا بے گناہی پر ۔۔۔ نہیں تھا جرم مگر میں نے اعتراف کیا
تمام عمر سراپا سپاس ہوں ، اُس نے ۔۔۔ کچھ اِس طرح کی سزا دی مجھے معاف کیا
وگرنہ کس کو خبر تھی کوئی خدا بھی ہے ۔۔۔ یہ بھید مجھ پہ کُھلا ، میں نے اِنکشاف کیا
یہ اور بات کہ رغبت مجھے اُسی سے رہی ۔۔۔ ہزار بار تھا جس شے سے انحراف کیا

پرانا داغ مٹانے کو آفتابؔ نیا
لگا کے داغ ہے دامن کو اب کے صاف کیا

•••

مِلا ہے درد کا زہراب مجھ کو ۔۔۔ کیے رکھتا ہے جو سیراب مجھ کو
ابھی ہے نام میرا نامکمل ۔۔۔ ابھی لگنے ہیں کچھ اعراب مجھ کو
زمیں سے دُور ہوتا جا رہا ہوں ۔۔۔ کہاں لے کر چلا گرداب مجھ کو
میں ورنہ خواب ہو جاتا ، کبھی کا ۔۔۔ سنبھالے جا رہے ہیں خواب مجھ کو
مجھے کتنا اپاہج کر گیا ہے ۔۔۔ مِلا جو عالمِ اسباب مجھ کو
یہ کیسی آگ تھی خستہ بدن میں ۔۔۔ جلی تو کر گئی شاداب مجھ کو

گہر بن کر نکل آؤں گا احمدؔ
ذرا ہونے تو دو غرقاب مجھ کو

•••

اجمل سروش

✽

رختِ ماتم تھا رات کیا گھر میں — چند آنسو تھے دیدۂ تر میں
گم ہوئی کس کے خال و خد کی شبیہہ — وقت کے بے کراں سمندر میں
یاد تیری اگر ہے راحتِ دِل — درد اُٹھتا ہے کس لیے سَر میں
رفعتوں کا خیال کارِ عبث — زورِ پرواز جب نہ ہو پر میں
دل کہیں محوِ جستجو ہے مرا — آنکھ گُم ہو گئی ہے منظر میں
غم مرا اوڑھ کر پڑی ہوئی ہے — اِک اُداسی مرے برابر میں
ہم وہ سادہ مزاج ہیں اجملؔ
آ گئے جو خدا کے چکر میں

●●●

نہالِ ذات کی شاخیں جلا کے رونے لگا — میں آگ اپنے بدن کو لگا کے رونے لگا
یہ وقت بھی کسی لمحے گزرنے والا ہے — اسی خیال میں تھا مسکرا کے رونے لگا
تمام شہر کی رنگینیوں سے اُکتا کر — نہ جانے کیا مجھے سوجھی، گھر آ کے رونے لگا
جب اپنی دربدری کا خیال آیا تو میں — شجر پہ بیٹھے پرندے اُڑا کے رونے لگا
نظر میں خوب ہوا کا مزاج روشن ہے — دِیا بنایا ، دِیے کو بنا کے رونے لگا
ثمر کے ساتھ ہواؤں نے کیا مذاق کیا؟ — درخت شاخِ تہی کو جھکا کے رونے لگا
نہ مِل سکا مری ہستی کا جب نشاں مجھ کو
میں اپنے نام کو اجملؔ مٹا کے رونے لگا

●●●

ارشد عباس ذکی

✻

چاک ہو جائے اگر رُوح کی پوشاک میاں — دشت میں جا کے پہن لیتے ہیں ہم خاک میاں
خاک سمجھو گے ہمیں ، خاک سمجھتے ہو ہمیں — تم تو رکھتے ہی نہیں خاک کا ادراک میاں
اب تو اس دشت کو ہم لوگ بسائے ہوئے ہیں — تھیں کسی دور میں یہ قیس کی املاک میاں
ہم زمیں زاد ترا ساتھ نبھانے سے رہے — راس آ جائے تجھے صحبتِ افلاک میاں
ان ہواؤں سے ذکی کیسے شکایت کی جائے
اپنا ہی جسم ہو جب صورتِ خاشاک میاں

•••

یہ جو زخمِ دل ہے اسے رفو نہیں کر رہا — میں ترے حوالے سے گفتگو نہیں کر رہا
کوئی اور ہے جسے ساری باتوں کا علم ہے — میرا راز افشا مرا عدو نہیں کر رہا
یہاں سارے شہر کو علم ہے کہ میں تیرا ہوں — میرا اعتبار صرف تو نہیں کر رہا
مری سرگزشت میں چودہ صدیوں کے زخم ہیں — میں ورق ورق کو یونہی لہو نہیں کر رہا
دلِ خوش گماں تجھے بس اسی کا ملال ہے
دلِ آرزو تری آرزو نہیں کر رہا

•••

ارشد سعید

٭

اُس کے تیور بھی بدلتے ہیں خیالات کے ساتھ جیسے حالات بدل جاتے ہیں دن رات کے ساتھ
تیری صورت سے ہی تحریر غزل ہوتی ہے تو بھی آتا ہے تصوّر میں کرامات کے ساتھ
یہ تو مانا کہ تجھے ٹوٹ کے چاہا میں نے کیا یہ اظہار ضروری بھی ہے جذبات کے ساتھ
وہ نظر آتا ہے ، شرما کے گزر جاتا ہے رسم ورہ وہ بھی بڑھاتا ہے اِسی بات کے ساتھ
زخمِ دل ، زخمِ جگر ، آنکھ سے بہتے آنسو تیرے بخشے ہوئے تحفے ہیں عنایات کے ساتھ
اُس کی آنکھوں میں جو دیکھے تھے غموں کے آنسو بھیگی پلکوں پہ سمت آئے ہیں برسات کے ساتھ
ایسے بھی لوگ زمانے میں ملے ہیں ارشدؔ
درد اوروں کا اُٹھا لیتے ہیں ،صدمات کے ساتھ

●●●

کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ مری خوشی کے لیے کہ اُس کا نام ضروری ہے زندگی کے لیے
یہ آسمان مری دسترس میں آیا اگر ستارے توڑ کے لاؤں گا میں کسی کے لیے
یہ کس سفر پہ روانہ کیا گیا ہے مجھے کہ ایک سایہ مِلا مجھ کو ہمد ہی کے لیے
کسی کے دردِ محبت کا پاس ہے مجھ کو سو اَشک آنکھ میں رکھتا ہوں میں نمی کے لیے
ابھی تو فکرِ زمانہ پڑی ہوئی ہے مجھے کہاں سے وقت میسر ہوں شاعری کے لیے
یہ کیسا دورِ سیاہ ہم پہ آ گیا ارشدؔ
کہ اپنا جسم جلاتے ہیں روشنی کے لیے

●●●

اشرف یوسفی

کیا بتاؤں میں تجھے دوست! بڑی ہے دُنیا یہ مرے خواب کے پیچھے جو پڑی ہے دُنیا
ایک دُنیا مرے اندر بھی ہے جس میں مَیں ہوں ایک بستر پہ مرے ساتھ پڑی ہے دُنیا
دِل سے تو بات بڑی دیر رہے گی اپنی تُو تو اس کھیل میں دوچار گھڑی ہے دُنیا
دیکھ تو کیسی بلا کی ہے فسوں ریز کشش موت کی آنکھ میں تصویر جڑی ہے دُنیا
کن زمانوں کا تسلسل ہے یہ زندانِ وجود کتنی صدیوں کے سلاسل کی کڑی ہے دُنیا
مَیں تہی دست کہاں اُس کو دکھائی دوں گا
لے کے ہاتھوں میں بہت پھول کھڑی ہے دُنیا

•••

بجھ گیا کارواں چراغوں کا دُور تک ہے دھواں چراغوں کا
کچھ نہ تھا جُز غبارِ شامِ الم مجھ کو گزرا گماں چراغوں کا
کس طرح آندھیوں سے ٹکرائے کچھ تو ڈھونڈو نشاں چراغوں کا
تم گئے اور بجھ گئے دِل بھی کیا کریں رفتگاں! چراغوں کا
دیکھنا تھا جمالِ رنگِ سحر دیکھتے ہیں دھواں چراغوں کا
صبح تک کون سرخرو ہو گا رات ہے اِمتحاں چراغوں کا
لو کی رفتار کیسے ناپو گے یہ مکاں ، لامکاں چراغوں کا
ایک میں تھا یا میری تنہائی لوگ سمجھے جہاں چراغوں کا
چشمِ سیّارگاں نے دیکھا کیا جو ہے انجام یاں چراغوں کا
دیکھ چپ چاپ ، ہاؤ ہو کیسی دِل تو ہے آستاں چراغوں کا
دیکھ منظر ہے اور ہی اشرفؔ
دُھند کے درمیاں چراغوں کا

•••

اعظم توقیر

✿

سچ کہوں گا تو سزا دیں گے ترے شہر کے لوگ
مجھ کو سولی چڑھا دیں گے ترے شہر کے لوگ
باتوں باتوں میں ترا ذکر کریں گے مجھ سے
یوں بھی زخموں کو ہوا دیں گے ترے شہر کے لوگ
ایک دیوار گرا دوں بھی تو اے جانِ غزل
نئی دیوار اُٹھا دیں گے ترے شہر کے لوگ
میں نے صدیوں میں تھا ہنسنے کا سلیقہ سیکھا
کیا خبر تھی کہ رُلا دیں گے ترے شہر کے لوگ
اِک لہو رنگ کے دریا سے گزاریں گے مجھے
یوں مری پیاس بجھا دیں گے ترے شہر کے لوگ
میں تو شمع ہوں مری عمر ہی کیا ہے ساقی
شب گزرتے ہی بجھا دیں گے ترے شہر کے لوگ
مجھ کو توقیر سے آوارہ بنا ڈالا ہے
اس سے بڑھ کر مجھے کیا دیں گے ترے شہر کے لوگ

●●●

کیا خاک گھنی چھاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
جلتے ہوئے صحراؤں میں رکھا گیا مجھ کو
مت پوچھ مرے عہدِ گزشتہ کی کہانی
گھنگرو کی طرح پاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
میں بامِ ثریا سے تھا ٹوٹا ہوا تارا
دم توڑتی آشاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
یہ بات الگ گھاؤ مرے اور بڑھے ہیں
کہنے کو مسیحاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
ہاں وہ بھی کسی اور پجاری کا خدا تھا
جس بت کی تمنّاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
وہ ہاتھ امانت تھا کسی اور کی شاید
جس ہاتھ کی ریکھاؤں میں رکھا گیا مجھ کو
جس گاؤں میں وحشت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا
توقیر اُسی گاؤں میں رکھا گیا مجھ کو

●●●

افروز عالم

✲

اب اپنی روایات سے ہم جوجھ رہے ہیں ۔۔۔ بگڑے ہوئے حالات سے ہم جوجھ رہے ہیں
آوارہ ہواؤں کا پتہ کون بتائے ۔۔۔ سازش کی عنایات سے ہم جوجھ رہے ہیں
کچھ بہہ گئے سیلاب میں کچھ رہ گئے محفوظ ۔۔۔ بے وقت کی برسات سے ہم جوجھ رہے ہیں
ہے چاند سی صورت مری تخلیق کا محور ۔۔۔ اور تاروں بھری رات سے ہم جوجھ رہے ہیں
رخسار کو چھونے نہیں دیتی تری زلفیں ۔۔۔ اس شوخ کی حرکات سے ہم جوجھ رہے ہیں
قرطاس و قلم ندرتِ افکار کے خوگر ۔۔۔ فرسودہ خیالات سے ہم جوجھ رہے ہیں

انکار کے لفظوں میں ہے اقرار کی صورت
عالؔم تری عادات سے ہم جوجھ رہے ہیں

●●●

جب اپنا سایہ ہی دشمن ہے کیا کیا جائے ۔۔۔ یہی تو ذہن کی الجھن ہے کیا کیا جائے
ہیں جس کے ہاتھ میں ذرے بھی ماہ و انجم بھی ۔۔۔ اسی کے ہاتھ میں دامن ہے کیا کیا جائے
اداس بام پہ موسم نے کھول دیں زلفیں ۔۔۔ کسی بیوگ میں جوگن ہے کیا کیا جائے
وہ شامِ لطف و طرب اور چاندنی سا بدن ۔۔۔ اسی خمار میں ناگن ہے کیا کیا جائے
وہ اپنی شوخ اداؤں سے لوٹتا ہے ہمیں ۔۔۔ بہت حسین یہ رہزن ہے کیا کیا جائے
وفا پرست ہے آتش فشاں کا رکھوالا ۔۔۔ صنم کدے میں برہمن ہے کیا کیا جائے

فریب دیتا ہے، عالؔم پہ راج کرتا ہے
عدو کے ہاتھ میں ہر فن ہے کیا کیا جائے

●●●

افضل خان

٭

جو یہ کہتے ہیں کوئی پیشِ نظر ہے ہی نہیں
کون سی ذات کے منکر ہیں اگر ہے ہی نہیں

بے ارادہ ہی ترے پاس چلا آیا ہوں
کام کچھ ہو تو کہوں تجھ سے مگر ہے ہی نہیں

لفظ سے لفظ مجھے جوڑنا پڑتا ہے میاں
میری قسمت میں کوئی مصرعۂ تر ہے ہی نہیں

اس لیے ہم کو نہیں خواہشِ حورانِ بہشت
ایک چہرہ جو اِدھر ہے وہ اُدھر ہے ہی نہیں

پھر جو اس شہر میں آنا ہو تو ملنا مجھ سے
گھر کا آسان پتا یہ ہے کہ گھر ہے ہی نہیں

چُھپ کے کرتا ہے کوئی میری ورق گردانی
میں نے رکھا تھا جہاں مور کا پر، ہے ہی نہیں

●●●

شکستہ آبگینے کو سہارا مار دے گا
مجھے دوری نہیں ملنا تمھارا مار دے گا

نہ رکنے والی گاڑی کا مسافر ہوں میں جس کو
چوراہے پر فروزاں سرخ اشارہ مار دے گا

تری گردن سمجھ مُٹھی میں ہے اے شہرِ شوخاں
تجھے جب چاہے گا یہ غم کا مارا مار دے گا

اُسے اک اور موقع دینے سے بہتر ہے مرنا
میں زندہ بچ گیا تو وہ دوبارہ مار دے گا

اسے تم کاروباری سلسلہ ہرگز نہ سمجھو
میاں یہ عشق ہے اس کا خسارہ مار دے گا

مرے آنسو سرِ مژگاں پہنچتے ڈر رہے ہیں
انہیں دریا نے چھوڑا تو کنارہ مار دے گا

●●●

افضل گوہر

✿

اب ہے مری حیرت کا یقیں دیکھنے والا ‌ ‌ ‌ پتھر سے وہ نکلا ہے نگیں دیکھنے والا
ہجرت کا ہمیں حکم بھی کس وقت مِلا ہے ‌ ‌ ‌ جاتے ہوئے جب کوئی نہیں دیکھنے والا
مت پوچھ کہ مٹی میں کہاں کون پڑا ہے ‌ ‌ ‌ اب کوئی نہیں زیرِ زمیں دیکھنے والا
یہ کس نے خدوخال کی ترتیب بدل دی ‌ ‌ ‌ ملتا ہی نہیں کوئی حسیں دیکھنے والا
مَیں کیسے اُسے چھوڑ کے منظر سے نکلتا ‌ ‌ ‌ اِک حسن کہ تھا چیں بہ جبیں دیکھنے والا
چلتے ہیں ذرا کور نصیبوں سے نکل کر ‌ ‌ ‌ شاید کوئی منظر ہو کہیں دیکھنے والا
یہ منظرِ شب یوں ہی بدلتا نہیں گوہؔر ‌ ‌ ‌ ہے کوئی کہیں عرش نشیں دیکھنے والا

•••

میں سُن رہا ہوں جو دُنیا سُنا رہی ہے مجھے ‌ ‌ ‌ ہنسی تو اپنی خموشی پہ آ رہی ہے مجھے
مرے وجود کی مٹی میں زَر نہیں کوئی ‌ ‌ ‌ یہ اِک چراغ کی لَو جگمگا رہی ہے مجھے
یہ کیسے خواب کی خواہش میں گھر سے نکلا ہوں ‌ ‌ ‌ کہ دن میں چلتے ہوئے نیند آ رہی ہے مجھے
کوئی سہارا مجھے کب سنبھال سکتا ہے ‌ ‌ ‌ مری زمین اگر ڈگمگا رہی ہے مجھے

میں اِس جہان میں خوش ہوں مگر کوئی آواز
نئے جہان کی جانب بُلا رہی ہے مجھے

•••

یہ جو دُنیا ہے تب و تاب سے ملتی جلتی ‌ ‌ ‌ اِک کہانی ہے مرے خواب سے ملتی جلتی
آسمانوں کے ستارے ہوں کہ دھرتی کے گلاب ‌ ‌ ‌ سب ہیں شکلیں مرے احباب سے ملتی جلتی
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے جاں کا ہر دم ‌ ‌ ‌ یورشِ غم بھی ہے سیلاب سے ملتی جلتی
دیکھئے کون سی رُت میں وہ کنول کِھلتا ہے ‌ ‌ ‌ دل کی حالت تو ہے تالاب سے ملتی جلتی

دیکھ کر اُس کو یقیں آیا ہے افضل گوہؔر
خاک بھی ہوتی ہے مہتاب سے ملتی جلتی

•••

امتیاز الحق امتیاز

٭

یہاں جس کی خدائی دیکھنے والوں نے دیکھی ہے
پھر اس کی رائی رائی دیکھنے والوں نے دیکھی ہے
زرِ خواہش چھپا کر میں نہیں رکھتا تجوری میں
مری تو پائی پائی دیکھنے والوں نے دیکھی ہے
مری خوبی کوئی شاید نظر آئی نہیں اُن کو
مگر میری بُرائی دیکھنے والوں نے دیکھی ہے
تری جادوگری کی دُھوم ہے چاروں طرف لیکن
مری معجزنمائی دیکھنے والوں نے دیکھی ہے
مرا دل تھا کہ کانٹوں سے کوئی ریشم اُلجھتا تھا
کہاں ایسی جدائی دیکھنے والوں نے دیکھی ہے
نظر آتی تھی جو دُنیا کسی نے بھی نہیں دیکھی
بس اُس نے جو دکھائی دیکھنے والوں نے دیکھی ہے

●●●

کیسا خیال آیا تھا ، کیسا بنا لیا
پتھر تراش کر اُسے شیشہ بنا لیا
اِک جبر کے پہاڑ کا تھا سامنا مجھے
مَیں نے قلم کی نوک کو تیشہ بنا لیا
دیکھی جو مَیں نے روشنی بیٹی کی آنکھ میں
دستار اپنی کاٹ کے بستہ بنا لیا
اِک لمحہ انتظار کا گزرا نہ تھا ابھی
کاغذ پہ مَیں نے وقت کا چہرہ بنا لیا
تعمیر میری تشنۂ تکمیل ہے ابھی
اُس نے مجھے بنانا تھا جتنا بنا لیا
تھا کوہِ سخت پیشِ نظر پھر بھی امتیازؔ
رستہ بنانے والے نے رستہ بنا لیا

●●●

انور شعور

✻

ہزار بار بلانے پہ گو نہ آئے وہ
کبھی کبھی چلا آتا ہے بے بُلائے وہ

صنم پرست نہ بن ، حسن سے مراد یہ ہے
کسی بھی شکل وشباہت میں آئے ، بھائے وہ

کہاں یہ گھر کے مہینے ، کہاں وہ اُس کی رات
اگرچہ ایک مسافر تھا مَیں ، سرائے وہ

ہزار شہر بسا لو ، خلا نہ پُر ہو گا
اُجڑ گئے ہیں گھرانے بسے بسائے وہ

سبو و جام سے اب تشنگی نہیں بجھتی
مجھے تو نین کٹورے سے کچھ پلائے وہ

توقعات سے بڑھ کے وہ خوب رُو نکلا
مگر جو دل میں تھے نقش و نگار ، ہائے وہ

بہار میں دَرِ مے خانہ ناشگفتہ ہے
جسے غرض ہو ، لہو سے طلب بجھائے وہ

شعوؔر آج غزل ہو گئی ہے کچھ ایسی
کہ مَیں اُسے نہ سناؤں ، مجھے سنائے وہ

•••

فرشتوں سے تو اچھا مَیں بُرا ہونے سے پہلے تھا
وہ مجھ سے انتہائی خوش خفا ہونے سے پہلے تھا

حقیقت سے خیال اچھا ہے ، بیداری سے خواب اچھا
تصور میں وہ کیسا؟ سامنا ہونے سے پہلے تھا

اگر معدوم کو موجود کہنے میں تامل ہے
تو جو کچھ بھی یہاں ہے آج ، کیا ہونے سے پہلے تھا

کسی بچھڑے ہوئے کا لوٹ آنا غیر ممکن ہے
مجھے بھی یہ گماں اِک تجربہ ہونے سے پہلے تھا

شعوؔر اِس سے ہمیں کیا ، اِنتہا کے بعد کیا ہو گا
بہت ہو گا تو وہ ، جو اِبتدا ہونے سے پہلے تھا

•••

یہ مت پوچھو کہ کیسا آدمی ہوں
کرو گے یاد ، ایسا آدمی ہوں

تعارف اور کیا اِس کے سوا ہو
کہ میں بھی آپ جیسا آدمی ہوں

زمانے کے جھمیلوں سے مجھے کیا
مری جاں! مَیں تمہارا آدمی ہوں

چلے آیا کرو میری طرف بھی
محبت کرنے والا آدمی ہوں

توجہ میں کمی بیشی نہ جانو
عزیزو! میں اکیلا آدمی ہوں

گزاروں ایک جیسا وقت کب تک
کوئی پتھر ہوں میں یا آدمی ہوں

شعوؔر آ جاؤ میرے ساتھ لیکن
میں اِک بھٹکا ہوا سا آدمی ہوں

اوصافِ شیخ

کب اُترے گا رُوح سے گارا مٹّی کا
مٹّی کی ہے جھیل ، کنارہ مٹّی کا

آنکھوں میں ہے صحراؤں سا سونا پن
پاؤں کے نیچے ہے انگارا مٹّی کا

اس کے ہیں سب رُوپ سبھی بہروپ یہاں
کھیل تماشا ہے یہ سارا مٹّی کا

میں نے چودہ چاند کیے ہیں جس کے نام
اس نے بھیجا ایک ستارا مٹّی کا

میں نے ہر دم کی دلداری مٹّی کی
میں نے ہر دم قرض اُتارا مٹّی کا

مٹّی کو روندا مٹّی کا خون کیا
ہو گا آخرکار اجارہ مٹّی کا

میں نے پاؤں جما رکھے اوصاف یہاں
میں نے سمجھا صاف اِشارہ مٹّی کا

باقی احمد پوری

✽

جام کی بات چلی، ذکر سبو کا نکلا
تیری آنکھوں میں تو منظر لبِ جُو کا نکلا

اپنے بارے میں کوئی بات بتاتا ہی نہیں
یہ ستارا بھی کسی عالمِ ہُو کا نکلا

مدتوں بعد کہاں ڈھونڈتے پھرتے ہو مجھے
میں تو اس شہر کی گلیوں سے کبھو کا نکلا

ہر کوئی میری طرف تیغ بکف آتا ہے
ہر کوئی پیاسا یہاں میرے لہو کا نکلا

حرص نے جال بچھائے ہیں جہاں میں کیا کیا
کوئی دولت کا، کوئی نام کا بھوکا نکلا

اب زمانے میں کیا جائے بھروسہ کس پر
جو مرا یار تھا وہ یار عدو کا نکلا

دل نہ برباد کیا ہم نے جنوں کی حد تک
زخم کھایا نہ کوئی کام رفو کا نکلا

اس کے ہونے سے بہاریں تھیں چمن میں باقیؔ
اس کے جاتے ہی وہ موسم بھی نمو کا نکلا

•••

کبھی سپاس گزاری کبھی شکایتِ عشق
یہی ہے اپنی کہانی یہی حکایتِ عشق

رہِ وفا میں شکستِ انا ضروری ہے
کہاں غرورِ خودی اور کہاں مسافتِ عشق

ہمیں نہ پوچھ کہ ہم تو بدل نہیں سکتے
تو اپنے دل سے طلب کر کوئی ضمانتِ عشق

غموں کو پال رہا ہوں بڑی محبت سے
مری طرح کوئی کرتا نہیں کفالتِ عشق

لہو نکلتا نہیں اور زخم بھرتا نہیں
عجب طرح کی جراحت ہے یہ جراحتِ عشق

رگوں میں خوں کی روانی ہے کس طرح ممکن
تمہارے دل میں نہیں ہے اگر حرارتِ عشق

اسی لیے تو کوئی راستہ نہیں ملتا
مسافروں کو میسر نہیں رفاقتِ عشق

ہزار اس کے معانی، ہزار تعبیریں
کسی سے ہو نہیں پائی مگر وضاحتِ عشق

خدا کرے کہ محبت میں پھر نہ آئے کبھی
وہ ایک ساعتِ ہجراں جو ہے قیامتِ عشق

مری غزل میں جو تاثیر و سوز و مستی ہے
مرا کمال نہیں یہ تو ہے عنایتِ عشق

اب اس کو بھول بھی جاؤ کسی طرح باقیؔ
اب اور کتنی کیے جاؤ گے ریاضتِ عشق

تنویر سیٹھی

*

اب ہوں جیسا مجھے ویسا نہیں رہنے دیں گے
مرے جذبے مجھے تنہا نہیں رہنے دیں گے

وقت اژدر کی طرح سب کو نگل جائے گا
یہ مہینے کوئی لمحہ نہیں رہنے دیں گے

یہ جو سورج کی طرح مجھ سے مِلا کرتے ہیں
یہ یقیناً مرا سایہ نہیں رہنے دیں گے

اس طرح ضبط کی تلقین کیے جاتے ہیں
یہ پڑوسی مجھے دریا نہیں رہنے دیں گے

ڈگڈگی اپنی اُداسی کی بجانے والے
آپ کے گاؤں کا میلہ نہیں رہنے دیں گے

کیا پتہ تھا وہ مرے دل سے چلے جائیں گے
اور یہاں اپنی تمنّا نہیں رہنے دیں گے

اس طرح خود کو بنائیں گے تماشا تنویرؔ
ہم کوئی اور تماشا نہیں رہنے دیں گے

•••

ترے حوالے سے اب کوئی بدگمانی نہیں
اسی لیے تو مری آنکھ میں روانی نہیں

جو مجھ پہ گزری ہے میں نے وہی لکھی ہے میاں
کتابِ عشق کسی اور کی کہانی نہیں

یہ آنکھ کیسے بجھائے گی شش جہات کی آگ
کہ اس کے پاس تو دو چار بوند پانی نہیں

پرانے شہر میں تم کو کہاں سے ڈھونڈیں ہم
ہمارے پاس تمہاری کوئی نشانی نہیں

نہ جانے تجھ کو یہ کس بات کا گھمنڈ ہے دل
میاں ! یہ خواب جوانی کوئی جوانی نہیں

دلِ تباہ پہ ہنستا ہوں اور سوچتا ہوں
یہ رائیگانی کوئی عام رائیگانی نہیں

اُداسیوں کے تسلسل میں گم ہوں میں تنویرؔ
کہاں کی صبح مری شام تک سہانی نہیں

•••

خالد ملک ساحل

*

ہجراں میں اب وہ ہجر کی لذّت نہیں رہی
گویا محبتوں میں وہ شِدّت نہیں رہی
خانہ بدوش آ گئے شہروں کے درمیاں
مجنوں کو بھی مکان سے وحشت نہیں رہی
خود کو اُٹھا کے راہ میں رکھا ہے کھول کر
دیکھو تو میری ذات میں غربت نہیں رہی
مَیں نے بڑے وقار سے دُنیا کو تج دِیا
کس نے کہا تھا عشق میں عزت نہیں رہی
اِک عالمِ خیال میں بسنے لگا ہوں مَیں
اب عالمِ وجود سے نسبت نہیں رہی
جی بھر کے اِس جہان میں زندہ رہا ہوں مَیں
اب دِل کو سرکشی کی بھی حسرت نہیں رہی
اِس کُنجِ بے نشان میں ساحلؔ سکوں تو ہے
لیکن یہ مسئلہ ہے کہ شُہرت نہیں رہی

•••

حادثے پیار میں ایسے بھی تو ہو جاتے ہیں
رتجگے خیمۂ تسکین میں سو جاتے ہیں
بعض اوقات ترا نام بدل جاتا ہے
بعض اوقات ترے نقش بھی کھو جاتے ہیں
چلتے چلتے کسی رستے کے کنارے پہ کہیں
یاد کے پھول مسافت میں پرو جاتے ہیں
تجھ کو دیکھا ہے تو آثار نظر آئے ہیں
تجھ کو دیکھا ہے تو ماضی کو بھی رو جاتے ہیں
ہم چلے جاتے ہیں اِس شہر کے جنگل سے کہیں
تم ہمیں درد کی خیرات تو دو ! جاتے ہیں

•••

کسی بھی راہ پہ رُکنا نہ فیصلہ کر کے
بچھڑ رہے ہو مری جان حوصلہ کر کے
مَیں انتظار کی حالت میں رہ نہیں سکتا
وہ انتہا بھی کرے آج ابتدا کر کے
تری جدائی کا منظر بیاں نہیں ہو گا
مَیں اپنا سایہ بھی رکھوں اگر جدا کر کے
مجھے تو بحرِ بَلاخیز کی ضرورت تھی
سمٹ گیا ہوں مَیں دُنیا کو راستہ کر کے
کِسی خیال کا کوئی وجود ہو شاید
بدل رہا ہوں مَیں خوابوں کو تجربہ کر کے
کبھی نہ فیصلہ جلدی میں کیجیے ساحلؔ
بدل بھی سکتا ہے کافر وہ بد دُعا کر کے

خاور جیلانی

٭

ہو نہ ہو، ہوں ضرور ، میں جو ہوں — کم نہیں یہ قصور ، میں جو ہوں
میں عبارت ہوں اس عبارت سے — اِس کے بین السطور میں جو ہوں
دُور مت جایئے مرے دِل سے — آپ کے دِل سے دُور میں جو ہوں
ہے! کوئی شخص جو ہے مرا غرور — اس قدر پُر غرور میں جو ہوں
اس طرح ہی خراب و خوار کہیں — ہو گا وہ بھی ضرور ، میں جو ہوں
کس لیے کرچیاں چنے ، اُس کے — سامنے چور چور میں جو ہوں
کیا نہیں ہوں وجود میں تم سا — ساکنانِ قبور! میں جو ہوں
اب تو خیر اپنی تشنہ کامی سے — لے رہا ہوں سرور ، میں جو ہوں
لہر ہوں اور اس لیے دریا — کر نہ پایا عبور ، میں جو ہوں
اس بیاں سے مراد ہے کہ یہاں — ہو نہ کیونکر فتور ، میں جو ہوں

●●●

عطائے بے بہا نے خیر کر دی — بنا مانگے دُعا نے خیر کر دی
کہاں قابل تھا میں ایسے کرم کے — مگر میرے خدا نے خیر کر دی
اجل ایسی خموشی سے کسی کی — صدا اُبھری ، صدا نے خیر کر دی
مہک اس رات کی رانی کی مجھ تک — چلی آئی ، ہوا نے خیر کر دی
وہ زعمِ پارسائی تھا کہ مَیں نے — خطا کی اور خطا نے خیر کر دی
الم سے دِل کہ خالی تھا ، اچانک — کسی حاجت روا نے خیر کر دی
یہ آمد کس کی تھی ایسی قیامت — کہ جس کے التوا نے خیر کر دی
بنے گی پھر بہم ہونے کی صورت — اگر ردِّ بلا نے خیر کر دی
سنانے میں سزا کے فیصلے کو — ترے حُسنِ ادا نے خیر کر دی

کہیں پیوند ہو جائیں گے ہم
جو خاکِ خوش عبا نے خیر کر دی

ڈاکٹر کوثر محمود

*

کوئی بھی نقشۂ دیوار و در اچھا نہیں لگتا
تری خوشبو نہ ہو جس میں وہ گھر اچھا نہیں لگتا

اُسے آہستہ رو ٹھنڈی ہوائیں کاٹ دیتی ہیں
سرِ راہے ، کوئی تنہا شجر اچھا نہیں لگتا

کسی خوش رنگ تتلی کے تعاقب میں چلے جانا
یونہی بے سمت کا چلنا مگر اچھا نہیں لگتا

کوئی جھگڑا بھی ہے کوثرؔ تو رستے کے تعین پر
وگرنہ کس کو خوشبو کا سفر اچھا نہیں لگتا

●●●

یہ معجزہ بھی مری چشمِ تر کرے ہی کرے
مرا سخن ، تری خوشبو ، سفر کرے ہی کرے

مرا ستارہ ، سیہ غار سے نہیں نکلا
مگر اُجالا ترے بام پر کرے ہی کرے

یہ آرزو کہ ترے دل میں اب رہا جائے
یہ آرزو مجھے اب دربدر کرے ہی کرے

تمہیں خبر ہے کہ دستِ قضا نے ٹھانی ہے
غنیمِ جاں کو مرا چارہ گر کرے ہی کرے

میں بے وسیلہ سہی، بے نشاں سہی کوثرؔ
ترا حوالہ مجھے معتبر کرے ہی کرے

●●●

سرور ارمان

✿

سچ ہے،ہم اس کے غم میں سیہ پوش کب ہوئے — پھر بھی وہ دن کسی کو فراموش کب ہوئے
کس سے کہیں لٹا ہے کہاں آ کے شہرِ دل — کس کو خبر یہ رند بلانوش کب ہوئے
اترا ہے سر سے بوجھ کہاں خاندان کا — ہم فکرِ روز و شب سے سبکدوش کب ہوئے
اس سوچ میں ہے منتظمِ میکدہ کہ لوگ — کب تک رہے شعور میں، مدہوش کب ہوئے
ماؤں سے دور ہو کے بھی پسرانِ خوش نصیب — محرومِ لطفِ گرمیٔ آغوش کب ہوئے

روکا گیا کسی سے کہاں شورِ احتجاج
یہ لب کہ عہدِ جبر میں خاموش کب ہوئے

•••

بلندیوں سے گریں تو ٹوٹیں نہ خواب کیسے — رہِ طلب میں سوال کیسے، جواب کیسے
یہ زندگی کتنی غیر محفوظ ہو گئی ہے — یہ قاتلوں نے پہن لیے ہیں نقاب کیسے
سفید ہوتا ہے خون کس طرح آدمی کا — عزیز رشتوں کے بند ہوتے ہیں باب کیسے
بتانا ممکن نہیں کہ صحرا کی وسعتوں میں — لپٹ کے پیروں سے چیختے تھے سراب کیسے
ملا ہوا ہے تمہارا قانون مجرموں سے — کرو گے غارت گروں کا تم احتساب کیسے
تمہیں خبر ہے کہ ہم غریبوں کی بستیوں میں — غروب ہوتے ہیں عمر کے آفتاب کیسے
نظامِ زر قتلِ آدمیت کا مرتکب ہے — جو یہ نہ بدلا تو آئے گا انقلاب کیسے
خزاں کو بھی مات دے کے رکھ دی ہے اس گھٹن نے — کھلیں گے دوزخ کی اس تپش میں گلاب کیسے

ہجومِ فاقہ کشاں تھا، تم تھے، کتابِ جاں تھی
میں کرتا اس کا تمہارے نام انتساب کیسے

•••

سلمان بشیر

✲

روگ اِک گرچہ اختیاری ہے
پھر بھی ہر رات ہم پہ بھاری ہے

زندگی کا کوئی بھروسا نہیں
اور وہ زندگی ہماری ہے

وصل کا آ گیا ہے پھر موسم
پھر سے وحشت سی ایک طاری ہے

اپنے زخموں کی بات کرتے ہو
ہم نے بھی زندگی گزاری ہے

جھوٹ کے پاؤں ہو بھی سکتے ہیں
رقصِ ابلیس بھی تو جاری ہے

ظلم کو ظلم کیوں نہیں کہتے
بس یہ کہتے ہو دُنیا داری ہے

●●●

سہیل ثاقب

٭

عجیب رنگِ سحر ہے کسی سے کچھ نہ کہو
خزاں گزیدہ شجر ہے کسی سے کچھ نہ کہو
نہ جانے کب کوئی سورج نمود پا جائے
سیاہ رات کو ڈر رہے کسی سے کچھ نہ کہو
یہ لوگ خود ہی بدل لیں گے راستہ اپنا
اماں کی راہ کدھر ہے کسی سے کچھ نہ کہو
خموش رہنے ہی میں عافیت سبھی کی ہے
ابھی تو دار پہ سر ہے کسی سے کچھ نہ کہو
بساطِ عشق مرے سامنے بچھی ہے مگر
خرد کو مات کا ڈر ہے کسی سے کچھ نہ کہو
تم اپنی راہ چلو اور ستارہ وار چلو
یہ زندگی کا سفر ہے کسی سے کچھ نہ کہو
یہ رنگ رنگ اُجالا یہ مہر و ماہ و نجوم
فقط فریبِ نظر ہے کسی سے کچھ نہ کہو
دُعائے خیر سدا مانگتے رہو ثاقبؔ
یہی فلاحِ بشر ہے کسی سے کچھ نہ کہو

●●●

تیرے ماتھے پہ شکن سی جو اُبھر جاتی ہے
میری قسمت مرے انجام سے ڈر جاتی ہے
کوئی مونس کوئی غمخوار ملے یا نہ ملے
زندگی سب کی بہرحال گزر جاتی ہے
جلنے دیتی ہی نہیں ہے مرے کمرے کا دِیا
یہ ہوا کام عجب شام سے کر جاتی ہے
جب فضاؤں میں بکھرتی ہے اُجالے کی کرن
رات چپ چاپ سمندر میں اُتر جاتی ہے
اِک مجھے چھوڑ کے ہر شخص فرشتہ ہے یہاں
بات کوئی بھی غلط ہو مرے سر جاتی ہے
اکثر ایسا بھی ہوا ہے شبِ تنہائی میں
کوئی خوشبو مجھے چھوتی ہے گزر جاتی ہے
وقتِ رُخصت در و دیوار نہ تکنا ثاقبؔ
زندگی اتنے اِشارے پہ ٹھہر جاتی ہے

●●●

سیّد احمد حسین

*

قطرہ وہم تری آنکھ میں لانا ہے مجھے
دشت ہی دشت ہوں، دریا نظر آنا ہے مجھے

ڈھے چکی وقت کی دیوار بھی اے صورتِ جاں!
اب ذرا رنگ کے ملبے کو ہٹانا ہے مجھے

یہ عجب چلہ کشی ہے کہ درختوں کی طرح
بس پرندوں کی طرف دیکھتے جانا ہے مجھے

یہ جو دریا ہے مری آنکھ میں حیرانی کا
اسی دریا سے تو آئینہ بنانا ہے مجھے

میں خموشی کا وہ لمحہ ہوں کہ ہر سانس کے ساتھ
بے اِرادہ تری آواز میں آنا ہے مجھے

میں چراغوں کی روایت میں کہاں سے آیا
اب جو آیا ہوں تو سورج نظر آنا ہے مجھے

شہر یارا! میں شہہِ مملکتِ دل زدگاں
قریۂ عشق میں دربار لگانا ہے مجھے

•••

میں کہیں ہوں، نہ جہاں ہے، تننا ھو یا ھو
وہی ہونے کا گماں ہے، تننا ھو یا ھو

ناچتی پھرتی ہے جو کوچہ و بازار کے بیچ
خاکِ آشفتہ سراں ہے، تننا ھو یا ھو

اُن چراغوں کا اُجالا تھا بہت دُور تلک
دُور تک جن کا دُھواں ہے، تننا ھو یا ھو

عشق یاں ناچتا ہے، حسن وہاں ناچتا ہے
ہر طرف ریشہ دواں ہے، تننا ھو یا ھو

تجھ کو جس رنجِ مسلسل کی تمنّا ہے، وہ غم
پسِ عیشِ گزراں ہے، تننا ھو یا ھو

رقص کرتے ہیں بگولے مری شریانوں میں
دل میں اِک دشتِ تپاں ہے، تننا ھو یا ھو

گرد اُڑتی ہے تو ہوتے ہیں خدوخال درست
بسکہ آئینہ فشاں ہے، تننا ھو یا ھو

مانعِ گردشِ پا ہو گئی زنجیر تو کیا
اب سدا وردِ زباں ہے، تننا ھو یا ھو

دیر تک چلتا گیا ہوں تو مِلا ہے یہ گھماؤ
حاصلِ عمرِ رواں ہے، تننا ھو یا ھو

ایک شخص اور بھی ہم رقص مرا تھا لیکن
آہ! وہ شخص کہاں ہے؟ تننا ھو یا ھو

وجد میں آ کہ ابھی چشمِ غزالانِ طرب
تیری جانب نگراں ہے، تننا ھو یا ھو

شہر یارا! مرے خونیں جگرا! آج سے تو
شہِ خونیں جگراں ہے، تننا ھو یا ھو

شاہین عباس

٭

نقش تھا اور نام تھا ہی نہیں یعنی میں اِتنا عام تھا ہی نہیں
خواب سے کام تھا وہاں کہ جہاں خواب کا کوئی کام تھا ہی نہیں
سب خبر کرنے والوں پر افسوس یہ خبر کا مقام تھا ہی نہیں
تہ بہ تہ انتقام تھا سرِ خاک انہدام ، انہدام تھا ہی نہیں
اُس بدن میں تھا میں تمام تو کیا وہ بدن میں تمام تھا ہی نہیں
ہم نے توہین کی ، قیام کیا اِس سفر میں قیام تھا ہی نہیں
اب تو ہے پر ہمارے وقتوں میں شیشۂ صبح شام تھا ہی نہیں
وہ تو ہم نے کہا کہ تم بھی ہو ورنہ کوئی نظام تھا ہی نہیں

•••

اب ایسے چاک پر کوزہ گری ہوتی نہیں تھی کبھی ہوتی تھی مٹی اور کبھی ہوتی نہیں تھی
بہت پہلے سے افسردہ چلے آتے ہیں ہم تو بہت پہلے کہ جب افسردگی ہوتی نہیں تھی
ہمیں تاریخ نے کچھ اور دکھلایا تھا نقشہ یہ گھر ہوتے تھے لیکن یہ گلی ہوتی نہیں تھی
ہمیں اِن حالوں ہونا بھی کوئی آسان تھا کیا محبت ایک تھی اور ایک بھی ہوتی نہیں تھی
تہی کو ہم بسر کرتے تھے اور دن ماپتے تھے ہمارا وقت اچھا تھا گھڑی ہوتی نہیں تھی
دیا پہنچا نہیں تھا ، آگ پہنچی تھی گھروں تک پھر ایسی آگ ، جس سے روشنی ہوتی نہیں تھی
ہمیں یہ عشق تب سے ہے کہ جب دن بن رہا تھا شبِ ہجراں جب اِتنی سرسری ہوتی نہیں تھی
ہمیں جا جا کے کہنا پڑتا تھا ، ہم ہیں ، یہیں ہیں کہ جب موجودگی ، موجودگی ہوتی نہیں تھی
برابر شور ہوتا تھا اِدھر بھی اور اُدھر بھی کبھی ایسا بھی تھا جب خامشی ہوتی نہیں تھی
کہانی کا جنہیں کچھ تجربہ ہے ، جانتے ہیں
کہ دن کیسے ہوا ، جب رات بھی ہوتی نہیں تھی

•••

اوپر جو پرند گا رہا ہے — نیچے کا مذاق اڑا رہا ہے
مٹی کا بنایا نقش اُس نے — اب نقش کا کیا بنا رہا ہے
گھر بھر کو یہ طاقچہ مبارک — خود چل کے چراغ آ رہا ہے
اب دوری حضوری کیا ہے صاحب — بس جسم کو جسم کھا رہا ہے
یہ وقت کا خاص آدمی تھا — بے وقت جو گھر کو جا رہا ہے
اب میں نہیں راہ میں تو رستہ — میری جگہ خاک اڑا رہا ہے
دروازے سے یوں جڑا ہوا شخص — دیواروں کا دکھ بڑھا رہا ہے
اوّل وہ غلط بنانے والا — آخر کو غلط مٹا رہا ہے
وہ قافلہ آ سکا نہیں کیوں
رستہ بھی تو واں سے آ رہا ہے

•••

دیکھنا ہے کب زمیں کو خالی کر جاتا ہے دن
اِس قدر آتا نہیں ہے جس قدر جاتا ہے دن
منتشر چلیے کہ یوں بازار بھر جاتا تو ہے
مشتہر کیجئے کہ پھر اچھا گزر جاتا ہے دن
جب ذرا رد و بدل ہوتا ہے اِس تعمیر میں
باہر آ جاتی ہے رات اندر اتر جاتا ہے دن
دن کی اپنی مستقل کوئی نہیں تاریخِ درد
زخم پر جاتا تھا اور اب داغ پر جاتا ہے دن
اچھی گنجائش نکل آتی ہے شام اور شور کی
جب کھنکتے خالی انسانوں سے بھر جاتا ہے دن
جاتے جاتے چھوڑ جاتا ہے مرے دل پر لکیر
دو اندھیروں میں مجھے تقسیم کر جاتا ہے دن
گلیوں گلیوں چلتی پھرتی دھوپ کا کیا کیجیے
کس کے گھر سے آتا ہے اور کس کے گھر جاتا ہے دن

•••

شکیل سروش

✽

یہ زمانہ آ گیا پھر میرے تیرے درمیان بن گئے پھر پاؤں کی زنجیر یہ رسموں کے پھول
پھول کی ہر پنکھڑی پر تیری ہی تصویر تھی اس طرح مہکے تھے شاخوں پر تری یادوں کے پھول
اس نے پھولوں کی جگہ بارُود بھیجا ہے مجھے میں نے اپنے خط میں بھیجے تھے جسے لفظوں کے پھول
سوچ کو مفلوج کر دیتی ہے دولت کی ہوس بانجھ دھرتی پر کبھی اُگتے نہیں سوچوں کے پھول
کھول کر بیٹھا ہوں میں ماضی کی البم کو سروشؔ
مسکراتے ہیں جہاں پہ اَن گنت چہروں کے پھول

•••

یا مرے رِستے ہوئے زخموں کو اچھا کر دے یا پھر ان زخموں کو پہلے سے زیادہ کر دے
رُوح کا بوجھ اُٹھانا نہیں ممکن اب تو اے خدا اب مجھے کاغذ سے بھی ہلکا کر دے
اس سے رکھنا ہے اگر دُور تو پھر میرے خدا اس سے بہتر ہے مجھے آنکھوں سے اندھا کر دے
میں اگر پانی ہوں تو آگ کی مانند ہے وہ تجھ سے ممکن ہے تو اِن دونوں کو یکجا کر دے
اس کی راہوں میں بکھر جاؤں گلابوں کی طرح
اے خدا تو مرے اس خواب کو سچا کر دے

•••

رہا ایسے وہ رات بھر نزدیک پھول خوشبو کے جس قدر نزدیک
پھر تو کچھ بھی دِکھائی دیتا نہیں اس کی آنکھیں نہ ہوں اگر نزدیک
رات بھر روشنی تھی آنکھوں میں اس کی آنکھیں تھیں رات بھر نزدیک
جس قدر مجھ سے دُور ہے وہ شخص اس کی یادیں ہیں اس قدر نزدیک
دُکھ سکھ آپس میں بانٹ لیتے تھے
بیٹھ کر دونوں لمحہ بھر نزدیک

•••

شیخ اعجاز

٭

ہمیں بت گری میں یہ کیا مِل گیا
صنم ڈھونڈتے تھے خدا مِل گیا ہے
بھلا کیسے دستِ سوال اب اُٹھے گا
جو مانگا تھا اُس سے سوا مِل گیا ہے
نہیں آرزو اب کسی چارہ گر کی
نصیبوں سے حاجت روا مِل گیا ہے
کبھی نہ اُٹھیں گے ترے آستاں سے
جو سوچا تھا وہ آسرا مِل گیا ہے
چلا آیا ظالم نگاہیں جھکائے
ریاضت کا ہم کو صلہ مِل گیا ہے
تجھے پا کے محسوس یوں ہو رہا ہے
خزانہ ہمیں بے بہا مِل گیا ہے
جو وقتِ نزع ہی وہ اعجاز آیا
ہمیں زندگی کا مزا مِل گیا ہے

•••

ثابت جو کبھی خود کو وفادار کریں گے
اُن لوگوں سے ہم پیار کا اظہار کریں گے
اُلفت سے بڑھائیں گے جو ہاتھوں کو ہم اپنے
پھر دیکھنا دُشمن بھی ہمیں پیار کریں گے
عاشق ہیں ڈرا ہم کو نہ محشر سے تو واعظ
ہم حسن کا ہر حال میں پرچار کریں گے
کہہ دو نہ ابھی آئیں عیادت کو ہماری
دِکھلا کے جھلک اور بھی بیمار کریں گے
یہ پیار اگر جرم کے زمرے میں ہے شامل
اِک بار نہیں جرم یہ سو بار کریں گے
سہہ جائیں گے دُشمن کا ہر اِک وار خوشی سے
لیکن نہ سہا جائے گا جو یار کریں گے
عالم کہاں رہتا ہے بہت دیر نزع کا
زحمت یہاں آنے کی وہ بے کار کریں گے
ہر شخص کو گرویدہ وفاؤں کا بنا کر
اعجاز ، محبت کا پرستار کریں گے

•••

صفی حسن

٭

نہ رنگِ لب کو نہ تابِ نظر کو دیکھتے ہیں
کہ ہم تو خوبیِ دستِ ہنر کو دیکھتے ہیں

بساطِ حرف بچھائے کوئی تو اہلِ نظر
دُعا سے پہلے دُعا کے اثر کو دیکھتے ہیں

اُنھیں بھی دیکھ کہ جو ذرہَ سفال میں بھی
جمالِ خوبیِ ''لعل و گہر کو دیکھتے ہیں''

جدا ہے اہلِ چمن سے ہماری فکرونظر
کہ ہم شجر سے مزاجِ ثمر کو دیکھتے ہیں

جو ایک بار تری چشمِ خواب میں اُترے
وہ پھر پلٹ کے کہاں اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ہم اپنے ذہن سے رہتے ہیں مائلِ پرواز
کہ وہ تو اور ہیں جو بال و پر کو دیکھتے ہیں

ہمیں ملال نہیں ہے صفیؔ اِن اشکوں کا
کہ ہم مآلِ صفِ چشمِ تر کو دیکھتے ہیں

•••

ابھی ہنسے بھی نہ تھے ہم کہ آنکھ بھر کے گئے
کہ تیرے قرب کے موسم اُداس کر کے گئے

یہ کیا کہ کھل نہ سکی ایک میرے دل کی کلی
چمن سے یوں تو کئی قافلے سحر کے گئے

میں لب بھی کھولوں تو مجرم مگر زمانے میں
ہزار فتنے سلامت تری نظر کے گئے

کسی نے بھی تو نہ کی دل کی بات اے یارو
سنا کے ہم کو فسانے اِدھر اُدھر کے گئے

یہ کیسی رسمِ وفا ہے کہ آج اپنوں نے
نظر جو بدلی مراسم بھی عمر بھر کے گئے

تمھیں خبر بھی نہیں رُوبرو ہواؤں کے
چراغ جو بھی گئے وہ تو میرے گھر کے گئے

نہ راہ میں کوئی دُشمن نہ رہزنوں کا سراغ
تو کیوں صفیؔ ترے سب حوصلے سفر کے گئے

•••

طارق ہاشمی

(غالب کی نذر)

ظلم آنکھ دیکھتی ہے مگر لب خموش ہے　　گویا کہ دوش پر نہیں سر، سر پہ دوش ہے
خندہ کا نام دوں کہ تبسم قرار دوں　　چہرے پہ جو پڑا ہوا اک درد پوش ہے
دل نے اُٹھائی محنتِ ہجراں تو یہ کھلا　　سمجھے تھے جس کو نرم، بہت سخت کوش ہے
دیکھو! اِن اشکِ خوں سے اب آنکھیں ہماریاں　　ہے پنجۂ مژہ کہ کفِ گل فروش ہے
طارقؔ! غمِ زمانہ سے بے سدھ ہے ہر نفس
کس کو مرا خیال، مجھے کس کا ہوش ہے

●●●

ستارے شب کو، نہ اب دن کو پھول جاگتے ہیں　　بس ایک ہم ہیں یہاں جو فضول جاگتے ہیں
غبار رکھتے ہیں کیا ایسا راستوں کے خلاف　　لیے ہوئے جو یہ پلکوں پہ دھول جاگتے ہیں
سلا دیے گئے ہیں سَرو بھی، صنوبر بھی　　اب اس زمین پہ ہر سو ببول جاگتے ہیں
محال ہے کہ ستارے کبھی شناسا ہوں　　عجب قرینے سے تیرے ملول جاگتے ہیں
یہی پیام ہے آنکھوں کو سو نہ جائیں ، جب　　پرندے جاگتے ہیں اور رسول جاگتے ہیں
کلام کرنا ہے اس پل خدا سے آنسوؤں نے　　جو رَد ہیں سوئے ہوئے ہیں، قبول جاگتے ہیں
اُنھی سے زندہ ہے آئینِ عشق بھی طارقؔ
وہ جن کی آنکھوں میں غم کے اصول جاگتے ہیں

●●●

طاہر شیرازی

٭

تصویر اس دل میں تمہاری تھی — کیا خواب نما بیداری تھی
اک کھڑکی مدت سے خالی — کمرے میں عجب بیزاری تھی
تھی مرگ ہواؤں میں رقصاں — اس بار دیئے کی باری تھی
تھا شب بھر قتلِ عام کوئی — دن بھر مقتول شماری تھی
اک بابرکت خاموشی میں — بے نطق تلاوت جاری تھی
اک پیاس کی کڑی مسافت میں
دریا سے میری یاری تھی

•••

نہ جانے یہ مجھے کیا جستجو ہے — کہ مر جاؤں اگر کچھ آرزو ہے
کسی ترتیب میں کل تک نہ تھا جو — وہ لمحہ آج میرے رُوبرو ہے
اگر میں کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں ہوں — تو پھر یہ کون مرے چار سُو ہے
جسے جس زاویے سے دیکھیے وہ — خمیدہ سر، مسلسل قبلہ رُو ہے
ہری ہے آج بھی شاخِ تمنّا — مری مٹی اگرچہ بے نمو ہے
تجھے اے راہزن یہ بھی نہیں یاد
ہمارا قافلہ سالار تو ہے

•••

عامر شریف

✿

ڈھونڈتا ہوں خود کو جانے، زندگی کے کس سفر میں — تیر پُرآشوب ہے اِک! یا کہ سینے میں، جگر میں
فصلِ گُل کی دیکھ کیا کیا، ڈالی ڈالی ہیں بہاریں — وحشتوں کی ہی جھلک ہیں لاکھ آنکھیں اس شجر میں
راس بلبل کو رہا کیا؟ جوشِ تنہائی! کہ ناداں! — میرے شکوے ہیں پشیماں آج میری ہی نظر میں
زُعم میں شکوے، بہت ہیں! بے خودی کے، یاد رکھنا! — آہ! زندہ ہے وہی میری، فغاں کے ہر اثر میں

آؤ عامرؔ، ہم چلیں سیرِ بیاباں کو کہیں اب
جوش برپا کر چلیں گے اب نظاروں کے شرر میں

●●●

بے مہر سے ملے جو سرِ شام ہیں یہی — کرتے ہیں مجھ کو قتل وہ گلفام ہیں یہی
اے موت! لے چلی ہے مجھے اور کس جہاں — وحشت کے اُس مکاں کے دَر و بام ہیں یہی
تعمیر کی لگن سے جسے زہر کم نہیں — اِس انجمن کے ٹوٹے تہی جام ہیں یہی
پہچان عندلیب بہاروں کا اب چلن — حرص و ہوائے کفر زدِ عام ہیں یہی

مضمر مرے قلم میں کئی جوش موجزن
عامرؔ ندائے کرب صد الہام ہیں یہی

●●●

علینا عترت

٭

شام کے وقت چراغوں سی جلائی ہوئی میں — گھپ اندھیروں کی منڈیروں پہ سجائی ہوئی میں
دیکھنے والوں کی نظروں کو لگوں سادہ ورق — تیری تحریر میں ہوں ایسے چھپائی ہوئی میں
خاک کر کے مجھے صحرا میں اُڑانے والے — دیکھ رقصاں ہوں سرِ دشت اُڑائی ہوئی میں
کیا اندھیروں کی حفاظت کے لیے رکھی ہوئی — اپنی دہلیز پہ خود آپ جلائی ہوئی میں
لوگ افسانہ سمجھ کر مجھے سنتے ہی رہے — درحقیقت ہوں حقیقت سے بنائی ہوئی میں
میری آنکھوں میں سمایا ہوا کوئی چہرہ — اور اس چہرے کی آنکھوں میں سمائی ہوئی میں
کتنی حیران ہے دُنیا کے مقدر کی نہیں — اپنی تدبیر کے ہاتھوں ہوں بنائی ہوئی میں

میرے انداز پہ تادیر علینا وہ ہنسا
ذکر میں اس کے تھی یوں خود کو بھلائی ہوئی میں

•••

اجنبی سا اِک ستارہ ہوں میں سیاروں کے بیچ — اِک جدا کردار ہوں اپنے ہی کرداروں کے بیچ
پھر رہی ہوں بے سبب پاگل ہوا سی جابجا — دُھند میں لپٹے ہوئے خاموش کُہساروں کے بیچ
اس حصارِ خاک کو جب توڑ کر نکلوں گی میں — ڈھونڈتے رہ جاؤ گے تم مجھ کو دیواروں کے بیچ
کچھ کڑے ٹکراؤ دے جاتے ہیں اکثر روشنی — جوں چمک اُٹھتی ہے کوئی برق تلواروں کے بیچ
اُڑ رہا ہے خشک پتا پوچھتا یہ بار بار — اجنبی سا کیوں ہوا میں اپنے گلزاروں کے بیچ

شکل یہ بہتر ہے لیکن پختگی کے واسطے
آؤ مٹی کو رکھیں کچھ دیر انگاروں کے بیچ

•••

عمران شناور

٭

چلو یہ تو سہولت ہو گئی ہے — ترے غم میں رعایت ہو گئی ہے
ستارے دیکھتا رہتا ہوں شب بھر — مجھے اِن سے عقیدت ہو گئی ہے
چھپا جاتا ہے چندا بادلوں میں — خفا ہے وہ، وضاحت ہو گئی ہے
پڑا رہتا ہوں میں بے جان ہو کر — عجب میری طبیعت ہو گئی ہے
وہ میری بے بسی پہ ہنس رہا ہے — کہ ہنسنا اس کی عادت ہو گئی ہے

سمٹ کر رہ گئیں لمحوں میں صدیاں
بہت لمبی مسافت ہو گئی ہے

●●●

یوں تو دیکھی ہیں بے شمار آنکھیں — وہ مگر تیری پرخمار آنکھیں
غم کی لہریں تھیں موجزن ان میں — میں نے دیکھی ہیں اشکبار آنکھیں
تیرے آنے کی آس ہے اب بھی — راہ تکتی ہیں بار بار آنکھیں
من کے اندر اگر اجالا ہو — دیکھ لیتی ہیں آر پار آنکھیں

خوبصورت لگے گی یہ دنیا
اپنے باطن کی تُو سنوار آنکھیں

●●●

فاروق طراز

٭

دُشمن کے فیصلے میں لچک بھی نہیں رہی پاس اپنے کوئی تازہ کمک بھی نہیں رہی
سب ولولے ہی وقت نے معدوم کر دیے خواہش مٹی تو دل میں کسک بھی نہیں رہی
گجرے کی باس ہجر کی زردی نے چاٹ لی ان چوڑیوں میں ویسی کھنک بھی نہیں رہی
مرجھا گئی ہے دُھند میں چہرے کی تازگی آنکھوں میں بے وفا کے چمک بھی نہیں رہی
کیسے بچائیں خواب پریشاں سے ہم تمہیں اپنی رسائی اپنے تلک بھی نہیں رہی
خوش رنگ بارشوں کی عنایت کے باوجود چہرے پہ آسماں کے دھنک بھی نہیں رہی
بے چہرگی کے خوف سے سمٹے ہوئے ہیں لوگ چہروں کی آئینوں میں جھلک بھی نہیں رہی
ہم سے زمیں کا آسرا بھی چھن گیا طرازؔ
اُمید تجھ سے بابِ فلک بھی نہیں رہی

•••

وقت مرہم بن نہیں سکتا یہ اندازہ نہ تھا درد میں شدت بھی تھی اور زخم بھی تازہ نہ تھا
کس کو فرصت تھی کہ رُک کر میرے اندر دیکھتا جسم سے باہر تو میرے دل کا شیرازہ نہ تھا
لے گیا ہے سر مرا میری سزا کے طور پر ورنہ ایسے جرم کا تو کوئی خمیازہ نہ تھا
ہم حصارِ درد سے باہر نکل آتے مگر ایسے گھر میں قید تھے ہم جس کا دروازہ نہ تھا
میرے شہروں میں لہو کی اِس طرح ہولی نہ تھی ایسے چہروں پر تو پہلے خون کا غازہ نہ تھا
شہر کی مردہ فضا میں بجھ گئے ہم بھی طرازؔ
شور کچھ باہر نہ تھا اندر بھی آوازہ نہ تھا

•••

مامون ایمن

*

آنکھ کے زنداں سے نکلے خواب کا منظر کوئی — وقت کا جرّاح کھولے زیست کا نشتر کوئی
خامشی کی بزم ہے تنہائی کی معراج ، یوں — گفتگو کی راہ میں رَہ رَو نہ ہے رَہ بر کوئی
بے خودی سی بے خودی ہے خودنمائی کی ادا — آئنہ آواز دیتا ہے ، ارے شہ پر کوئی
پھول کے پہلو میں کیوں چبھکے ہے کانٹے کی چبھن — دیکھنا ، گلشن میں آ نکلا ہے دیدہ وَر کوئی؟
کیا کہیں یہ اپنے اپنے ظرف کی سوغات ہے — کوئی ہے قطرے کا پرتو ، ذات میں ساگر کوئی
کاہے کو معلوم تھی یہ بات ہنستے جذبوں کو — جان لے سکتا ہے ہنس کر پھول سا پتھر کوئی
پھیلتا جاتا ہے سایہ ، ضبط کی دیوار پر — اِک نئے انداز سے چمکے گا پھر خاور کوئی
دھوپ چھاؤں کے سبب ہیں وقت میں کتنے ہی رنگ — یاد کے لمحے مگر ، اَخضر کوئی ، اَصغر کوئی

دیکھتا ہوں وقت کو مڑ مڑ کے ، ایمن! کس لیے
کیا تعاقب میں ہے میرے یاد کا اژدَر کوئی

•••

ضبط کے زنداں میں رہ کر ذات کی پرواز ہو — اے زمانے! وقت کی قسمت میں وہ اعجاز ہو
یاد کی صورت پکارے کوئی جھونکا رات دن — خامشی ہی جذب کی دہلیز پر آواز ہو
مسکراہٹ کے چمن میں پھول مہکیں آس کے — زیست کی دیوار پر سایہ سراپا ناز ہو
کون سنتا ہے کسی خاموش دھڑکن کی صدا — آرزو کے باب میں اِفشا کبھی یہ راز ہو
یہ ضروری تو نہیں کہ جذب کی تسکین کو — دھڑکنوں کے ہاتھ میں احساس ہی کا ساز ہو
ہار کر بھی معرکہ جیتے کوئی تقدیر کا — خواب کی مانند اُلٹا دہر میں اِک تاز ہو

جگمگائے دِل کو ، ایمن! کوئی منظر آس کا
خواب کی بستی میں اِک دن کوئی دَر تو باز ہو

•••

مبشر سعید

✽

پہلے وہ اچانک نظر آیا، اُسے دیکھا — پھر دل نے کیا اور تقاضا، اُسے دیکھا
وہ حسن بڑی دیر رہا سامنے میرے — پھر میں نے میاں، جس طرح چاہا، اُسے دیکھا
وہ پل تو مری آنکھ سے جاتا ہی نہیں ہے — اک روز دریچے سے میں جھانکا، اُسے دیکھا
وہ حسن کے معیار پہ پورا تھا بہر طور — دیکھا ہی نہیں کوئی بھی جیسا، اُسے دیکھا
اک شام وہ کچھ ایسا کھلا ایسا کھلا بس — جیسا میں سمجھتا تھا سو، ویسا، اُسے دیکھا
وہ حسن تھا کچھ اپنی ستائش کا طلب گار — دریا تھا مگر پیاس کا صحرا، اُسے دیکھا
دریا سا سمندر میں اترنے کو تھا بیتاب — اُترا اُسے دیکھا، جو وہ ڈوبا، اُسے دیکھا

چھایا ہے خیالوں میں سعیدؔ ایسا کوئی شخص
لگتا ہے کہ جس نے مجھے دیکھا، اسے دیکھا

●●●

میں تو بیٹھا تھا ہر اک شے سے کنارا کر کے — وقت نے چھوڑ دیا دوست تمہارا کر کے
بات دریا بھی کبھی رک کے کیا کرتا تھا — اب تو ہر موج گزرتی ہے اشارہ کر کے
اِک دیا اور جلایا ہے سحر ہونے تک — شبِ ہجراں ترے نام ایک ستارا کر کے
جب سے جاگی ہے ترے لمس کی خواہش دل میں — رہنا پڑتا ہے مجھے خود سے کنارا کر کے

دشت! چھانے گا تری خاک محبت سے سعیدؔ
عشق! دیکھے گا تجھے سارے کا سارا کر کے

●●●

محمد مختار علی

٭

جسم میں رسمِ تنفس کا عمل جاری ہو   تم جو چھولو تو نئے خواب کی تیاری ہو
رات میں صبح اُڈتی ہو کہ تم آن ملو   نیند کی نیند ہو بیداری کی بیداری ہو
تم جو سوئے رہو، سورج بھی نمودار نہ ہو   عکس کے شوق میں آئینے کی تیاری ہو
کتنے دلچسپ خیالوں کو جنم دیتی ہے   وہ مری چپ ہو کہ منظر کی سخن کاری ہو
نہ سہی شاعری ، پیغمبری ، مختار مگر
کون ہے جو مرے الہام سے اِنکاری ہو؟

•••

چراغِ رہگزر! اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں   کسی کو کیا خبر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں
ذرا سا شور بھی دِل کے لیے بارِ سماعت ہے   سکوتِ بام و در اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں
کوئی رُکتا نہیں ، سنتا نہیں رُودادِ تنہائی   بہ مثلِ رہگزر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں
بظاہر کٹ رہا ہے وقت ہنستے کھیلتے اپنا   عزیزانِ سفر! اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں
سجا لیتے ہیں بزمِ دوستاں حیلوں بہانوں سے   حقیقت میں مگر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں
میسر ہیں چراغ و انجم و مہتاب و آئینہ   بھری محفل ہے پر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں
جمالِ یار سے رونق سہی مختار منظر میں
پر اے جانِ جگر! اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں

•••

مرشد سعید ناصر

٭

وہ کر رہا ہے حقیقت میں اِک بلا سے جنگ
کبھی کسی نے بھی جیتی نہیں اَنا سے جنگ

میرا شعور مجھے مصلحت سکھاتا ہے
مگر ، ضمیر کی ہے جبر ناروا سے جنگ

میں لڑ رہا ہوں اکیلا کئی خداؤں سے
کسی خدا سے عداوت کسی خدا سے جنگ

میں گھورنے کا عمل چھوڑ کے روانہ ہوں
مرے دماغ میں جاری ہے اب خلا سے جنگ

میرے حروف لرزنے لگے جو ہونٹوں پہ
تو ہاتھ کرنے لگے ہیں تیری عطا سے جنگ

در قبول سے ٹکرا کے لوٹ آنے پر
طلب ،طلب نہ رہی ،ٹھن گئی دُعا سے جنگ

دُعا بدلتا ہے ، سکے کی قدر وقیمت سے
سدا ، گدا کی رہی ہے میری سخا سے جنگ

جو پل رہی ہے یقیناً سماج دیکھے گا
نئی طرح کی بغاوت نئی ادا سے جنگ

وہ ابروؤں کے اِشاروں سے مات دیتی ہے
میری بلا سے بغاوت میری بلا سے جنگ

یہ کھیل تھا تو کوئی ضابطے بنانے تھے
ہے اِبتداء کی کسی روز انتہاء سے جنگ

●●●

منصور آفاق

یہی دوچار برس آنکھ نے رونا ہے تمہیں
ہو بھی جاؤ جو کسی اور کا ہونا ہے تمہیں

آخری بات کہ کس وقت ملیں گے کل ہم
مجھ کو معلوم ہے اب رات ہے، سونا ہے تمہیں

یاد رکھنا کہ تمہیں چارہ گری کرنی ہے
زخم سینے ہیں مرے، چاک پرونا ہے تمہیں

کیا گزارو گے اسی خیمۂ افلاک میں رات
کیا بنانا یہی فٹ پاتھ بچھونا ہے تمہیں

کوئی خودکش سا دھماکہ بھی ضروری ہے وہاں
جلدی سے جائے وقوعہ کو بھی دھونا ہے تمہیں

تم سے پہلوں نے جہاں اپنے قدم رکھے تھے
اسی آسیب زدہ غار میں کھونا ہے تمہیں

رُوح تک دیکھنے کی تم میں بصارت ہی نہیں
صرف کافی یہی مٹی کا کھلونا ہے تمہیں

سرخ فوارہ کی دھاروں کے دمادم کی قسم
رات کی چھاتی میں بس تیر چبھونا ہے تمہیں

دیکھنے ہیں مجھے جذبوں کی صراحی کے خطوط
میں نے وہسکی سے کسی روز بھگونا ہے تمہیں

صرف ہم نصف کے مالک ہیں بحکمِ ربی
فصل بھی کاٹنی ہے بیج بھی بونا ہے تمہیں

میری باہو سے ملاقات ہے ہونے والی
زندگی! ''ہو'' کے سمندر میں ڈبونا ہے تمہیں

تم پرندے ہو کسی وقت بھی اُڑ سکتے ہو
ساتھ رکھنے کے لیے جاں میں سمونا ہے تمہیں

جس میں چلتی چلی جاتی ہے قیامت منصورؔ
اُس دوپٹے کا پکڑنا کوئی کونا ہے تمہیں

●●●

پرانے غم کے نئے احتمال بسم اللہ
آ انتظار کے اِک اور سال بسم اللہ

بس ایک تیری کمی تھی جنوں کے صحرا میں
خوش امدید اے میرے غزال بسم اللہ

آ دیکھ زخم تروتازہ ہیں مہکتے ہیں
آ مجھ سے پوچھنے پرسانِ حال بسم اللہ

اندھیرے کروٹیں لیتے ہیں مجھ سے پہلے بھی
بہ سرو چشم شبِ ذوالجلال بسم اللہ

سنا ہے آج اکیلا ہے اپنے کمرے میں
چل اس کے پاس دلِ خوش خیال بسم اللہ

لگی تھی آنکھ ذرا ہجر کی تھکاوٹ سے
میں اُٹھ گیا میرے دشتِ ملال بسم اللہ

یہ کیسے خانۂ درویش یاد آیا ہے
بچھاؤں آنکھیں؟ اے خوابِ وصال بسم اللہ

پھر اپنے زخم چھپانے کی رُت پلٹ آئی
شجر نے اوڑھ لی پتوں کی شال بسم اللہ

کھنچا ہوا ترا ناوک نہ جان ضائع ہو
ہے جان پہلے بھی جاں کا وبال بسم اللہ

یہ تیرے وار تو تمغے ہیں میری چھاتی کے
لو میں نے پھینک دی خود آپ ڈھال بسم اللہ

یہ لگ رہا ہے کہ اپنے بھی بخت جاگے ہیں
کسی نے مجھ پہ بھی پھینکا ہے جال بسم اللہ

نہیں کچھ اور تو اُمید رکھ ہتھیلی پر
دراز ہے مرا دستِ سوال بسم اللہ

کسی فقیر کی اُنگلی سے میرے سینے پر
لکھا ہوا ہے فقیدالمثال بسم اللہ

میں رہ رہا ہوں مکانِ درود میں منصوؔر
چراغ کلمہ ہے، مال منال بسم اللہ

•••

فراق کی انتظارگاہ میں کہیں شرابیں کھلی پڑی ہیں
کہیں بجھی سگریٹوں کے ٹکڑے، کہیں کتابیں کھلی پڑی ہیں

کہا تو ہے سر پھری ہوا سے چلے سنبھل کر بہت سنبھل کر
میں خیمۂ کائنات ہوں اور مری طنابیں کھلی پڑی ہیں

کوئی تو آیا ہے خواب گاہِ دل ونظر میں، یہ چھپ چھپا کے
تجوری ٹوٹی ہوئی ہے غم کی ، تمام خوابیں کھلی پڑی ہیں

جو انتظاروں کے ہم نفس ہیں قفس میں بس ہیں وہی پرندے
ملن کے چڑیا گھروں میں وحشت بھری شتابیں کھلی پڑی ہیں

وہاں ہے رخشِ حیات منصوؔر اپنا پہنچا ، جہاں ابد پر
کہیں پہ ٹوٹی ہوئی ہیں باگیں، کہیں رکابیں کھلی پڑی ہیں

•••

ناصر بشیر

٭

اگر ہجوم نے رستہ دیا تو آؤں گا
میں سرگزشتِ سفر آپ ہی سناؤں گا

سبک سری میں سہی ، نام تو کماؤں گا
میں تیرے واسطے ، دُنیا کے ناز اُٹھاؤں گا

اگر یہ دھوپ ترا جسم چھونے آئے گی
میں بادلوں کو تری چھت پہ کھینچ لاؤں گا

میں آج آنکھ سے ٹپکا ہوں اور گال پہ ہوں
کل آسمان پہ جاؤں گا ، جگمگاؤں گا

میں دیکھ لوں گا کہ ہے کون کون دوست مرا
میں جان بوجھ کے تھوڑا سا لڑکھڑاؤں گا

ذرا سی دیر رہوں گا تمہاری محفل میں
پھر اپنے جیسے ہی لوگوں میں لوٹ جاؤں گا

میں چپکے چپکے نہ بیچوں گا خونِ دل اپنا
گلی میں نکلوں گا ، آواز بھی لگاؤں گا

ذرا سی اور پلاؤ کہ ہوش آئے مجھے
نہیں پیوں گا تو کچھ اور ڈگمگاؤں گا

مرا جنون ہے مجنوں سے کچھ الگ ناصرؔ
سو اپنے واسطے صحرا بھی خود بناؤں گا

•••

سارا گناہ پھر کہیں ساقی کے نام ہو
اب کے فقیہِ شہر نہ محرومِ جام ہو

اے چشمِ نیم باز! ہماری طرف نہ دیکھ
تیرا خیال ہے کہ یہاں قتلِ عام ہو؟

پھر آرزوئیں دینے لگیں ، دِل پہ دستکیں
دروازہ کھول ، شاید انھیں تجھ سے کام ہو

اچھی کہو ، بُری کہو ، لہجہ نہ سخت ہو
ایسے کہو کہ بات کا بھی احترام ہو

جب وار کیجیے تو خبردار کیجیے
اِتنا تو دوستوں کے لیے اِلتزام ہو

یہ روزِ ابر ہے نہ شبِ ماہتاب ہے
اچھا نہیں کہ پینے پلانے کا کام ہو

ناصر بشیر زخم ، بدن کے چھپا کے رکھ
کیا جانے کس جگہ ترا نیلامِ عام ہو

•••

ہم اہلِ درد کو پابندِ اِلتجا نہ کرو
جو ناخدا بھی نہیں ہیں ،انھیں خدا نہ کرو
جو رہزنوں سے مراسم پہ ناز کرتا ہے
اُس آدمی کو تو سالارِ قافلہ نہ کرو
ہماری پیاس ، ہمارے ہی پاس رہنے دو
کرم کرو ، ہمیں محرومِ کربلا نہ کرو
جنون ، اہلِ جنوں ہی کو زیب دیتا ہے
زمانے والو ہمیں دیکھ کر ہنسا نہ کرو
تمھیں مِلا ہے جو کردار ، وہ نبھاتے رہو
پہاڑ ہو تو ہمیں راستہ دیا نہ کرو
تمام شہر کو ہم پیچھے چھوڑ سکتے ہیں
ہمارے ساتھ اگر تم مقابلہ نہ کرو
تمہارے سینے میں پتھر کا دل سہی ناصؔر
یہ بزمِ یار ہے ، باتیں تو شاعرانہ کرو

•••

ہم جب آواز اُٹھائیں گے تو سب بولیں گے
وہ جو بیٹھے ہیں اُدھر، مہر بہ لب ، بولیں گے
عہدِ گویائی ہے یہ سنگ تراشوں سے کہو
پتھروں سے بھی بناؤ گے تو لب ، بولیں گے
اپنی تنہائی میں روتے ہیں تو رونے دے ہمیں
تیری محفل میں بہ آہنگِ طرب بولیں گے
مصلحت کیش نہیں ، دل میں کوئی خوف نہیں
جب بھی بولے، یہی بے نام ونسب بولیں گے
اپنی خاموشی کی قیمت بھی یہ لگواتے ہیں
زر کے دیوانے سرِ بزمِ طلب بولیں گے
ہم پرندوں کی تصاویر بنا کر ناصؔر
بیٹھ کر سوچ رہے ہیں کہ یہ کب بولیں گے

•••

واعظِ خشک اگر پند و نصیحت نہ کرے
کیسے ممکن ہے کہ شہر اُس سے محبت نہ کرے
حوصلے میرے ستم گر کے بڑھاتا ہے یہی
کتنا ظالم ہے کہ دل اس کی شکایت نہ کرے
آج اس شہر میں ہوں ،کل میں چلا جاؤں گا
میرے دیوانے سے کہہ دو، مجھے عادت نہ کرے
اِس کا مطلب ہے کہ انصاف بہت مہنگا ہے
قاضیِ شہر اگر مجھ سے رعایت نہ کرے
میری تلوار میں دم خم ہے مگر مجھ میں نہیں
میرے دُشمن سے کہو، جنگ کی نیت نہ کرے
جبر کو رکھتے ہیں وہ شاملِ آئین حیات
یہ بھی کہتے ہیں کہ اب کوئی بغاوت نہ کرے
ناصؔر اشعار میں دل کھول کے رکھ دیتا ہے
کس طرح شہرِ سخن پر وہ حکومت نہ کرے

•••

ندیم بھابھہ

٭

تیر، نیزے، ڈھال اور تلوار دے کر آ گیا
اپنا سب کچھ ہی سپہ سالار دے کر آ گیا

ہارنے کے خوف سے یہ فیصلہ کرنا پڑا
جنگ سے پہلے میں سب ہتھیار دے کر آ گیا

عین ممکن ہے وہ میرا نام تک رہنے نہ دے
میں اُسے اپنے سبھی آثار دے کر آ گیا

وقت نے دُہرا دیا قصہ مرے اسلاف کا
اہلِ مکہ کو میں پھر گھر بار دے کر آ گیا

اپنے حصے کی حکومت بھی اُسی کو سونپ دی
میں ندیمؔ اُس کو بھرا دربار دے کر آ گیا

•••

تھکن کے ساتھ اسی راستے میں رہنے دے
ندیمؔ مجھ کو ابھی فاصلے میں رہنے دے

میں زندگی سے ابھی اور لڑنا چاہتا ہوں
مرا وجود ابھی حادثے میں رہنے دے

میں منزلوں سے نہیں راستوں سے ہوں مانوس
تو مجھ کو بھٹکے ہوئے قافلے میں رہنے دے

میں اس کہانی کا کردار تو رہا ہی نہیں
مگر کہیں تو مجھے واقعے میں رہنے دے

سفر بھی ختم ہوا زندگی بھی ختم ہوئی
اور اب سکوں سے مجھے مقبرے میں رہنے دے

کتابِ عشق مکمل تو ہو چکی ہے ندیمؔ
پر انتساب ابھی مشورے میں رہنے دے

•••

نصرت صدیقی

※

تم اپنا راستہ بدلو اگر بدلنا ہے
وہ چاند ہے تو اسے سب کے ساتھ چلنا ہے
شرارِ ضبطِ الم آنسوؤں میں ڈھلنا ہے
ہوا چلی نہ چلے برف کو پگھلنا ہے
ہم اس لیے بھی نہیں بولتے کہ جانتے ہیں
ہماری بات کا مفہوم کیا نکلنا ہے
نگاہِ یار بتا تیرا فیصلہ کیا ہے؟
مجھے بدلنا ہے یا وقت کو بدلنا ہے
تو آؤ مل کے چلیں روشنی کو عام کریں
ہماری طرح اگر آپ کو بھی جلنا ہے
ہم ایک دوسرے کی ڈھال کیوں نہ بن جائیں
کمانِ وقت سے تیروں کو تو نکلنا ہے
تو پھر نگارِ جہاں سے نہ دل لگا نصرتؔ
اگر یہ طے ہے کہ رُکنا نہیں ہے چلنا ہے

•••

جو آبروئے جلوۂ گلزار ہو گئے
آخر وہ پھول زینتِ بازار ہو گئے
پھر بھی نہ ترجمانیٔ جمہور ہو سکی
شائع اگرچہ سینکڑوں اخبار ہو گئے
ایسے کچھ اب کے پھیلے ہیں شہروں کے دائرے
گاؤں سمٹ کے نقطۂ پرکار ہو گئے
پھر کون طے کرے گا سفر دھوپ کا اگر
ہم بھی رہینِ سایۂ دیوار ہو گئے
حد سے بڑھی جو بھوک تو مجبور والدین
اولاد بیچنے پہ بھی تیار ہو گئے
دو چار روز بزمِ نگاراں میں بیٹھ کر
کچھ بوالہوس بھی صاحبِ کردار ہو گئے
میری غزل میں اور ہی مضمون آ گئے
جس دن سے دُور وہ لب و رُخسار ہو گئے
قسمت کی بات ہی سہی حیرت کی بات ہے
تم جیسے لوگ صاحبِ دستار ہو گئے
نصرتؔ میں کیا بتاؤں کہ پیشِ جمالِ یار
میرے حسیں خیال بھی بے کار ہو گئے

•••

وقتِ سحر بھی روئے ہیں ان کو پکار کے
ہم نے دِیئے بجھائے نہیں انتظار کے

بے کار تذکرے ہیں یہ عہدِ جدید میں
دامن کے تار اور گریباں کے تار کے

لائے گئے نہ پھر بھی کسی انتخاب میں
ہم آدمی ضرور تھے پہلی قطار کے

تیرے کیے پہ جو بھی ندامت ہوئی ،ہوئی
تو حوصلے تو دیکھتا مجھ شرمسار کے

میں نے پڑھے تو اور بھی نمناک ہو گئے
بھیگے ہوئے خطوط کسی اشکبار کے

یہ ہوش مند اور یہ موقع شناس لوگ
معیار پر نہ آئے کبھی اوجِ دار کے

نصرتؔ میں لکھنے بیٹھا تو بالکل نئے لگے
لکھے پڑھے یہ شعر مرے بار بار کے

•••

دشت میں سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں
زندگی! میں ترے غم خوار کہاں سے لاؤں

رات میں صبح کے آثار کہاں سے لاؤں
تیرے جلوے ترے انوار کہاں سے لاؤں

روز لاشوں کی نمائش نہیں دیکھی جاتی
کیا کروں اِتنے عزادار کہاں سے لاؤں

بھر دیا تلخیٔ دوراں نے غزل کا دامن
تیرے گیسو ترے رُخسار کہاں سے لاؤں

لے گیا کون بھرے شہر کی گہما گہمی
اب وہی رونقِ بازار کہاں سے لاؤں

بن گئے اچھے بھلے لوگ ہوس کے بندے
میں محبت کے سزاوار کہاں سے لاؤں

دل محبت سے گریزاں تو نہیں ہے نصرتؔ
مال و زر کے مگر انبار کہاں سے لاؤں

•••

ہو جائے اُجالا ہی اُجالا مرے آگے
پردے سے کسی روز نکل آ مرے آگے

یہ حُسنِ طلب ہے کہ یہ دھوکا ہے نظر کا
دریا کی طرح بہتا ہے صحرا مرے آگے

مجبور بشر ہوں بھلا مختار کہاں ہوں
رازق نہ سمجھ ہاتھ نہ پھیلا مرے آگے

میں تیرے تعاقب میں کہاں تک چلا آیا
کعبہ مرے پیچھے نہ کلیسا مرے آگے

میں دیکھ رہا تھا کہیں پھولوں کی نمائش
لے آیا کوئی تیرا سراپا مرے آگے

رستے میں کھڑے ہیں تری تصویر اُٹھائے
آئینہ صفت نقشِ کفِ پا مرے آگے

وہ رات کی ظلمت ہو کہ ہو دن کا اُجالا
رہتا ہے ترا چاند سا چہرہ مرے آگے

فرقت کے اندھیروں کو سمٹنا ہی پڑے گا
روشن ہے ترا وعدۂ فردا مرے آگے

سائے کی طرح ساتھ رہی ہے سدا نصرتؔ
دُنیا مرے پیچھے کبھی دُنیا مرے آگے

•••

وصی نقاش

٭

کوئی دلیل جب نہ رہی آسماں کے پاس
سورج نے آنا چھوڑ دیا سائباں کے پاس

تم سے بچھڑ کے اور تو کچھ بھی نہیں ہوا
میرا یقین رہنے لگا ہے گماں کے پاس

ہو جاؤں ایک دن مَیں مکمل خدا کرے
جاں میرے پاس اور مَیں رہ جاؤں جاں کے پاس

مصنف نے مجھ کو دیکھ کے یہ فیصلہ دیا
اِس بے نشاں کو رکھ دو کسی بے نشاں کے پاس

کہتے ہیں اُن کا قلب ہے عاری خلوص سے
بیٹھے ہوئے جو رہتے ہیں سود و زیاں کے پاس

اظہارِ حق کے واسطے مظہر بھی ہو کوئی
اِک داستان گو بھی رہے داستاں کے پاس

چھوڑا جو اپنے گھر کو تو کچھ بھی نہیں بچا
بس ایک تیر ہی کی جگہ تھی کماں کے پاس

اشعار اپنے دیکھ کے نقاشؔ یوں لگا
لفظوں نے گھر خرید لیے ہوں زباں کے پاس

احمد سہیل

ہاتھوں پر لکھی ہوئی موت

میں سوجاتا ہوں
وہ میرے ہاتھوں پر موت لکھ جاتی ہے
میں اسے پھول بھجواتا ہوں
وہ مجھے قتل کیے ہوئے آدمی بھیجتی ہے
وہ دھوپ چھاؤں پر کھڑی ہے
اور ہواؤں کو مٹھی میں گرفتار کر کے
دیر تک روتی ہے
وہ خواب پکڑنا چاہتی ہے
ساحل پر رہنے والی لڑکی
نیلے رنگ کی عادی ہے
وہ مچھلی اور جال کی لغت ہاتھ میں تھامے
سمندر سے لڑتی ہے
چاند ہر رات خواب بن کر آتا ہے
اور اس کے بستر سے اُٹھتے ہی
ہتھیلیوں میں غائب ہو جاتا ہے

●●●

الیاس بابر اعوان

کیٹ واک

ہوا کے زرد پھریرے پہ اپسراؤں کا نور
وہ ذوقِ ترکِ حجابات میں گندھی آنکھیں
خرابہ ہائے ریاضت سے لرزاں بار قدم
تلاشِ صندل و سیمیں بدن میں گُرگِ فساد
سجے سجائے ، تنے ، ایستادہ ، رنگ نژاد
یہاں پہ جسم برائے فروخت ہوں جیسے
اِسی جہانِ نظر میں ، وہ حسنِ خواب انگیز
جو عکسِ آب پہ کچھ اس طرح سے چلتا ہے
کہ جیسے رقص پہ مائل کسی چراغ کی لَو
ثباتِ مشقِ ستم دُور تک ہُمکتا ہوا
وہ حرفِ دامنِ صد چاک ، نا تمام کلام
کسی کے لمسِ سماعت سے آشنا ہو کر
شعورِ دید کے تلخاب واہموں کے دروں
بس ایک پل کی تجلّی کو آشکار ہوا
پھر اس کے بعد ہجومِ خرامِ صحبتِ نو
طلوعِ جلوۂ تازہ پہ مسکرا اٹھا
بس ایک ساعتِ خستہ میں تالیوں کا شور
پھر ایک عمر کی خاموشی ہمرکابِ جاں
یہی ہے حسنِ نظارا کی دائمی ترکیب

●●●

وقت ناوقت

سہمے سہمے ہوئے لہجے کی کھنک سے پہلے
دشت میں شور ، گرفتارِ صدا تک نئیں تھا
ایک حیرت تھی مگر ورطۂ حیرت سے نہال
ازمنِ رفتہ کی بے کیف تجلّی سے ورا
ایک ان دیکھا ہوا ربط بنائے ہوئے تھی
برگ وارفتہ مگر پیڑ کی دیوار سے دُور
چھتریاں تان کے رستوں پہ کھڑے ملتے تھے
اُن دنوں آنکھیں چمکتی تھیں ، لہو بولتا تھا
ہم دروبام پہ رکھتے تھے محبت کے چراغ
ان دِکھے رستوں کی تاریکی و حیرت سے پرے
کتنے تقسیم شدہ لوگ تھے پر یکجا تھے
اُن دنوں وقت وراثت میں دیا جاتا تھا
میں اُسی وقت کا اک لمحۂ بے مایہ ہوں
مرے ہمراہ چلا تھا کبھی اک سیلِ غبار
میں بھی تھا معتکفِ دیدۂ حیران مگر
اب یہاں تلخ زمانوں کے پڑے ہیں ٹکڑے
جن کی رفتارِ قدم مجھ سے کہیں بہتر تھی

●●●

عطا تراب

خارجی مظاہر

سنو سنو! ہم سے کہہ رہی ہے یہ پاک دھرتی
کمین گاہوں میں بیٹھ کر بھی ہو سارے غازی
کہ منفعت کی رفاقتوں پر ہو کتنے راضی
سبھی نمازی
سنپولیوں کو پلا رہے ہیں جو دودھ، تم ہو
جو قاتلوں پر بھی بھیجتے ہیں درود، تم ہو
جبھی تو قاتل عدالتوں سے بری ہوئے ہیں
جبھی تو بیش از ہمیشہ قاتل ستم گری پر جری ہوئے ہیں
قتیل مجرم ہیں اور قاتل عدالتوں کی نظر میں ممتاز ہو رہے ہیں
یہ خود فریبی ہے زہرِ قاتل
کہ ہم ریال و دِرَم کا پاکیزہ دودھ ان کو پلا رہے ہیں
بھلا ہمیں کیسے ڈس سکیں گے
سنو سنو میں ہوں پاک دھرتی
میں تم سے ایسے نہ بین کرتی
کہ سانپ چاہے حجاز کے ہوں کبھی مقدس نہیں رہے ہیں
بھلے تمھیں ڈس نہیں رہے ہیں
جو آستینوں میں سانپ پالو گے کوئی تم سے مصافحہ تک نہیں کرے گا

●●●

مامون ایمن

رُباعیات

اِک خواب کا نشہ ہے اُتر جائے گا
موہوم سا طوفاں ہے گزر جائے گا
اندیشہ ہے اِحساس کو ، تسکیں پا کر
شیرازہ کسی دل کا بکھر جائے گا

●●●

کہسار کی بانہوں میں دمن ہے دُنیا
صحرا کی نگاہوں میں چمن ہے دُنیا
ہر ہونٹ پہ قصہ ہے مسکاں کا ، لیکن
جھونکا جو یہ کہہ دے کہ زمن ہے دُنیا

●●●

رِم جھم ہے خیالات کی پہنائی میں
ہو ہاؤ کی بوچھار ہے تنہائی میں
گم راہی کا اِک خوف ہے آ گاہی کو
چھپ سکتی ہے شہرت کسی رُسوائی میں

●●●

روئے گی اگر آنکھ تپک تو ہو گی
مچلیں گے جہاں خواب جھپک تو ہو گی
سو جائیں گی ظلمات کے دِل میں کرنیں
صرصر سے چراغوں میں لپک تو ہو گی

●●●

پیغام جہاں وقت کا بکھرا ہو گا
تنہائی میں تنہائی کا چرچا ہو گا
ہر سانس میں تڑپے گی طلب کی صورت
سینے میں اگر عشق کا سودا ہو گا

●●●

خوابوں سے سدا زخم چنا کرتا ہے
وحشت میں جنوں کرب بنا کرتا ہے
سناٹا اگر اُس کی بھی قسمت ہو ، دِل
جو شور قرابت کا سنا کرتا ہے

●●●

آوارہ مزجی کا تماشا ٹھہرے
ہرجائی قدم ضبط کا جھونکا ٹھہرے
اِک راز ہے تقدیر کے آئینہ میں
اِک چہرہ نہاں خانہ میں اپنا ٹھہرے

●●●

خوشیوں سے ملاقات پہ رونا آئے
غم زاد خیالات پہ رونا آئے
ممکن ہے کبھی بیٹھے بٹھائے اِک دِن
بے بات کسی بات پہ رونا آئے

●●●

محسن مگھیانہ

دوہے

الف اللہ نام ہے اُس کا جس کے ہر سو رُوپ
دیکھنے والا دیکھ سکے ہے ہو چھایا یا دھوپ

آ جا میرے اندر آ کے ، دیکھ لے اپنا رُوپ
تجھ کو من میں قید کیا ہے لگنے دوں نہ دھوپ

آ جا ساجن لے چلوں میں دریا کے اُس پار
دُکھ جہاں پہ ڈھونڈ نا پائیں کھوجیں تجھے ہزار

تجھ سے پھوٹیں کرنیں ایسی چندرما کہلائے
تیرے رُوپ کی سندرتا سے آئینہ شرمائے

آ جا بادل رتھ پہ بیٹھ کے تجھ کو سیر کراؤں
تیرے سنگ میں اُڑتا جاؤں کسی کے ہاتھ نہ آؤں

رُوٹھو نہ تم ایسے گوری جیون کے دن چار
ڈال دو میرے شانوں پر تم بانہوں کے یہ ہار

اکھیاں میری برسیں چھم چھم ساون بھادوں آئے
اس موسم میں پچھلی ب اری تم سے نین لڑائے

وہ بھی لکھے غزلیں دیکھو شاعری فرمائے
وہ تو آپ غزل ہے ساری کون اُسے سمجھائے

ڈولی لے گئے ویری تیرے ڈھول پہ بیٹھا چاٹ
محسن جیت سکا نہ اُس کو نہلاوے ہے جاٹ

ناصر ملک

لوری

(ایک زلزلہ زدہ لڑکی کے منظوم الفاظ)

چلو اِک بار پھر سے ہم
اجل کے سرخ پنجوں سے نکل کے زندگی اَوڑھیں
یہ مٹی اپنے پیاروں نے لہو سے گوندھ رکھی ہے
اِسی مٹی میں پتھروں کو پرَ وکر ہم نئے گھر کی بنا ڈالیں
چلو ماضی کی یادوں میں نیا سپنا سجا ڈالیں
اُنھی سنگلاخ پتھروں نے مرے ''بابا'' کو نگلا ہے
اِسی ملبے نے میری ''ماں'' کو مجھ سے چھین رکھا ہے
اِسی ٹوٹے ہوئے دَر نے مرا ''لالہ'' چبا ڈالا
اِسی کونے میں ''باجی'' نے فنا کا ذائقہ چکھا
چلو اُٹھو کہ ان بکھری ہوئی چیزوں کو پھر جوڑیں
یہیں سے راستہ ڈھونڈیں، اِنھی پتھروں سے سر پھوڑیں
درختوں پر لٹکتی روٹیوں سے بھوک اچھی ہے
ہوس آلودنظروں سے بھوک اچھی ہے
یہ پتھر مار دیتے ہیں مگر نوچا نہیں کرتے
یہ انسانوں سے بہتر ہیں، بُرا سوچا نہیں کرتے
چلو اُٹھو مرے بھیا! چلو جاگو مرے بھیا!
اُٹھو تنکے اکٹھے کر کے اپنا آشیاں جوڑیں

کہ برسوں بعد پہلے کی طرح سب کچھ سجا ہوگا
مگر ''امی'' نہیں ہوگی، یہاں ''بابا'' نہیں ہوگا
ہائے ''باجی'' نہیں ہوگی، مرا ''لالہ'' نہیں ہوگا
چلو اُٹھو مرے بھیا! اجل سے بھاگ جاتے ہیں
کھلونے ٹوٹ جاتے تھے جنھیں ہم جوڑ لیتے ہیں
گھروندے ٹوٹ سکتے ہیں جنھیں اَب جوڑنا ہوگا
یہی پتھر ہمیں اپنوں سے اِک دن جا ملائیں گے
اُنھی پتھروں سے جیون بھر مقدر پھوڑنا ہوگا
چلو اُٹھو مرے بھیا! اُٹھو جاگو مرے بھیا!
اجل کے سرخ پنجوں سے نکل کر زندگی اوڑھیں

●●●

نیلم احمد بشیر

کاغذ کے پُرزے

''نامنظور! نامنظور! پرانے الیکشن نامنظور! نئے الیکشن کروائے جائیں۔ہمیں پرانی نئی کی جگہ سچ مچ نئی قیادت کی ضرورت ہے۔ ہمارا مطالبہ! الیکشن، الیکشن!''

الیکشن میں جیتنے والے اُمیدواروں نے عوام نام کا ماسک پہنا اور ایک ہجوم پیچھے لگائے سڑکوں پر نعرے لگوانے کے لیے خود ہی نکل پڑا۔ یہ ہجوم بھولی بھالی بھیڑوں کا تھا جن کا ہمیشہ سے ایک ہی مقدر ہوتا ہے کہ وہ آنکھوں پر اندھے اعتماد کی پٹی باندھے، گلے میں رسّی ڈلوائے، گھسٹتے، لڑھکتے، بہتر دِنوں کی اُمید، میں اس راستے پر بس چلتی ہی چلی جائیں جس پر انھیں لے جایا جا رہا ہو۔

پٹاری کھلی تو اب کی بار اس میں سے کوئی معمولی سانپ برآمد نہیں ہوا۔ ایک بھوکا، خونخوار، ظالم، خودغرض، اژدھا اُچھل کر باہر نکل آیا۔اس کی باہر نکلتی، پتلی، لمبی زبان اور ہیبت ناک سائز کو دیکھ کر بھیڑیں اس کی طاقت کے آگے جھک گئیں۔

''الیکشن دیوتا! ہم آپ کے غلام ہیں! کہیے آپ کے کھانے کے لیے کیا پیش کریں؟''

اژدھا پھنکارا۔

''اچھا اچھا! ابھی لائے!''

لوگوں نے اپنی اُمیدیں، آرزوئیں، خواہشات اور خوش فہمیاں بوٹی بوٹی کر کے خونخوار اژدھے کا پیٹ بھرنے کے لیے اس کے آگے پھینکنا شروع کر دیں۔ مقابلہ حسبِ معمول دو پارٹیوں کے درمیان تھا۔ لال پارٹی اور سبز پارٹی کی ایک جیسی طاقت کو دیکھتے ہوئے یہ جانچنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون جیتے گی اور کون کم پر خلوص ہے؟ دونوں پارٹیاں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں۔

لال پارٹی والے، روٹی، کپڑا، مکان کا نعرہ لگا کر، مزدوروں، کسانوں اور طلباء کی اکثریت کو ساتھ مِلا کر الیکشن جیتنا چاہتے تھے اور سبز پارٹی والے مذہبی نظریات کا پرچار کر کے، جنت میں رہائشی سکیموں کے پراپرٹی ڈیلر ہونے کا دعویٰ کر کے، عوام کے ووٹوں کی اکثریت حاصل

کرنا چاہتے تھے۔

شہر کے ہر کونے سے الیکشن کی مہم زور وشور سے جاری تھی۔ کہیں بینر لگ رہے ہیں تو کہیں پوسٹر چسپاں کیے جا رہے ہیں۔ کہیں لاؤڈ سپیکر پر اشتہار بازی جاری ہے تو کہیں پمفلٹ تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ چوک کے دونوں طرف، دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کی بڑی بڑی تصاویر والے جائنٹ سائز بورڈ لگے ہوئے تھے ہر آنے جانے والا ان کی طرف نظر ڈالنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

لال پارٹی کی لیڈر ''امی جان تھیں۔ ان کی تصویر بڑی پیاری تھی۔ وہ تصویر میں اپنی مخصوص مسکراہٹ اور سفید دوپٹہ لیے ہر آنے جانے پر ممتا بھری نظریں نچھاور کرتی تھیں، جیسے ہی کوئی راہ گیر ان کی تصویر کے آگے رُکتا تصویر کہہ اُٹھتی۔

''ہیلو بے بی!'' اور ایک ٹافی آگے بڑھا دیتی۔

رُکنے والا ''یس ماما! یس ماما!'' کہہ کر ٹافی پر بھوکے بچے کی طرح ٹوٹ پڑتا یہ منظر ساتھ ہی لگی بورڈ کی تصویر بھی دیکھ لیتی۔ یہ تصویر جو امی بھائی کا سا پوز مارے، واسکٹ پوش سبز پارٹی کے لیڈر کی تھی وہ فوراً اپنے گنجے سر پہ رنگ برنگی وِگ رکھ لیتا اور گانے لگتا۔

''اس میں مونگ پھلی کا دانہ!''

وہ ایک بسکٹ عوام کی طرف بڑھاتا۔

''آئی لائک اٹ، آئی لو اِٹ۔'' بچہ بچہ خوشی سے جھوم اُٹھتا۔

دونوں پارٹیوں نے عوام کو ہر ممکن طریقے سے اپنی طرف کھینچنے کے پورے پورے انتظام کر رکھے تھے۔ عوام سوچ رہی تھی کہ کس راستے کو منتخب کیا جائے۔ دونوں راستے ہی خوش آئند مستقبل کی اُمیدوں کے وعدوں کی پھول پتیوں سے مزین اور خوشنما نظر آتے تھے۔ روشنیوں کے قمقموں سے جگمگاتے، آنکھیں خیرہ کیے دیتے تھے۔

''بیوقوفو! ہاتھوں میں ہاتھ ڈالو، گیت گاتے ہوئے ہمارے بتائے ہوئے راستے پہ چل نکلو۔''

دونوں لیڈر انھیں اپنی بات سمجھانا چاہتے تھے اور دامِ اُلفت میں پھنسانا چاہتے تھے۔

چوک کے بیچوں بیچ بنے، گول راؤنڈ اباؤٹ کے سر پہ تو ہری ہری جھنڈیاں لہرا رہی تھیں لیکن گھیرے پہ ابھی تک کسی نے کوئی اشتہار بازی نہیں کی تھی۔ گھیرا خالی تھا۔

''چل بھئی اِدھر لگا دے!''

لال پارٹی کے کارکنوں نے پوسٹر چپکانے والے کو اِشارے سے بتایا۔ پوسٹر چپکانے والا لئی کی بالٹی اُٹھا کر گھیرے کے قریب جا بیٹھا اور جلدی جلدی ایک کے بعد ایک، امی جان دوپٹے

والی کی فوٹو والے پوسٹر چپکانے لگا۔

اس کے تن بدن میں ان دو سو روپوں کی اُمید ہلچل مچا رہی تھی جو اسے شام کو اس اوورٹائم جاب کے بعد ملنے تھے۔ وہ خوشی خوشی بڑے اہتمام سے گھیرے کے گلے میں پوسٹروں کا ہار پہنا رہا تھا کہ یکدم کسی نے ایک ٹھوکر مار کر لئی کی بالٹی اوندھی کر دی۔

اس نے سر اُٹھا کر دیکھا۔

سبز پارٹی کا ایک کارکن اسے گریبان سے پکڑ چکا تھا۔

''تیری یہ مجال! سرخ بیلچے جیسی شکل والے۔ میں ابھی تجھے بتاتا ہوں کہ یہاں کس کے پوسٹر لگیں گے!''

اس نے مریل سے دو سو روپے کے اُمیدوار کو، تھپڑ اور گھونسے رسید کرنے شروع کر دیئے۔

سبز پارٹی کے کارکنوں سے بھری پجیرو میں سے موٹے موٹے سانڈ یکے بعد دیگرے اُترنے لگے۔ ان کی موٹی موٹی کمروں کے اِردگرد لمبے لمبے لوہے کے گرز بندھے ہوئے تھے جنھیں انھوں نے اُترتے ہی اِردگرد گھمانا شروع کر دیا۔

''تمہاری یہ جرأت! ہماری جگہ پہ اپنے پوسٹر!''

اب کی بار ایک دوسرے نے بھی اسے پیٹنا شروع کر دیا۔

''معاف کر دیں، مائی باپ! میں بال بچے دار آدمی ہوں۔'' وہ چلاتا رہا لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔

اس نے ہاتھ پاؤں جوڑ دیئے، منتیں کیں لیکن انھوں نے اسے اتنا مارا کہ وہ بھی لئی کی بالٹی میں سے باہر گری ہوئی لئی بن گیا۔

''ملعون! جا، ہم تجھے جنت کے پلاٹوں کی ہاؤسنگ سکیم میں پلاٹ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ خدا تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا!''

ایک بار پھر، سبز پارٹی کے ورکر نے، اس کے سینے کی طرف اُنگلی سے ایسی لیزر بیم پھینکی کہ اس میں سے نکلتے شعلے نے پوسٹر چپکانے والے کو بھسم کر کے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

''آیا پی نٹ کا زمانہ! اس میں مونگ پھلی کا دانہ!''

واسکٹ پوش لیڈر نے اپنے بورڈ میں سے مسکرا مسکرا کر گانا شروع کر دیا۔

سبز پارٹی والوں نے ''امی جان سر پہ دوپٹہ لینے والی کے سارے پوسٹر اُتار پھینکے اور اس کی جگہ اپنے محبوب لیڈر کے پوسٹر لگانے شروع کر دیئے۔''

اب ان کا کارکن اپنی لئی کی بالٹی اُٹھا کر اپنے دوسو روپے انعام کے خواب دیکھنے میں مصروف، جلدی جلدی کام نپٹانے لگا۔

کتنا اچھا نظارہ تھا۔ سرسبز، خوبصورت، خوشنما گھاس پہ لہراتی، ہری ہری چوڑیوں جیسی بانکی ہری جھنڈیاں، ناچ، گا رہی تھیں۔

''ٹھہرو! یہ پوسٹر بازی نہیں ہوسکتی! تم نے ہمیں سمجھا کیا ہے؟ کیا ہم نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں، تمہاری یہ مجال کہ ہمارے ورکر پہ ہاتھ اُٹھاؤ۔''

ایک دوسری پجیرو سر پہ آن کھڑی ہوئی تھی اور اس میں سے بدصورت تھوتھنیوں والے سور اُترنے لگے۔ ان کی آنکھیں اپنی متوقع جیت کے خمار سے نشیلی ہو رہی تھیں اور ان کی ہاتھوں کی جگہ کلاشنکوفیں اُگ آئی تھیں۔

گرز اور کلاشنکوفیں بوس و کنار میں مصروف ہوگئیں۔

سانڈؤں اور سوروں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

''ساتھیو! کامریڈو! میں تمہیں جنت تو کیا اس زمین میں پلاٹ لے کر دوں گی! جو زیادہ مشکل کام ہے!'' امی جان دوپٹے والی اپنے بورڈ میں سے چیخ چیخ کر بولنے لگیں۔

''کفر بکتی ہے یہ! نا ہنجار، مغرب زدہ عورت!''

باریش سبز پوش ورکر واسکٹ والے لیڈر کے سر پہ ہاتھ رکھ کر گلا پھاڑنے لگا۔ ایک سانڈ اور ایک سور لڑتے لڑتے زمین پہ ڈھیر ہو چکے تھے۔ دونوں کے جسموں سے رسنے والا مٹیالے رنگ کا خون پیاسی زمین پر بہہ کر دھیرے دھیرے، اس میں جذب ہونے لگا دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ خون زیادہ پیاسا تھا کہ زمین۔

''دیکھو بھائیو! یہ بات ٹھیک نہیں!'' سانڈوں اور سوروں کے جتھے میں سے ایک ایک بندہ آگے کو بڑھا۔ ہم دنوں پارٹیوں نے ایک ایک ورکر گنوا دیا لیکن چلو کوئی بات نہیں۔ ورکر تو اور مِل جائیں گے۔ پوسٹر لگانے کے لیے اس سے بہتر گول چکر کا گھیرا ہمیں نصیب نہیں ہوگا، اس لیے کیوں نہ ہم دونوں پارٹیاں ہی کچھ سمجھوتے والی بات کر لیں۔ آپس میں ہی معاملہ طے کر لیں، تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔ دیکھو نا شام پڑنے والی ہے، اور پھر شام ضائع تو نہیں کرنی نا!''

اس نے شرارت سے آنکھ ماری۔ دوسرے سب لوگ ہنس پڑے۔''

کتنی اچھی بات کر رہے ہیں بھائی جان آپ! صلح صفائی بہت پیاری چیز ہے کہیے کیا کریں؟'' گرز والے نے اپنا گرز فولڈ کر کے رکھ دیا۔ کلاشنکوف کے ہاتھ والے کی کلاشنکوف بھی

یکایک یوں جھڑ گئی جس طرح سگریٹ سے بجھتی ہوئی راکھ جھڑ جاتی ہے۔

''آیئے بھائی جان، گلے ملتے ہیں اور ایسا کرتے ہیں کہ آدھا گھیرا آپ لے لیں اور آدھا ہم۔ دونوں اچھے اچھے بھائی، مل مل کر، پیارے پیارے پوسٹر لگوا لیتے ہیں ٹھیک ہے نا!''

''ٹھیک ہے! ٹھیک ہے بھئی۔'' دونوں پارٹیوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

''بھائی جان! ان دونوں کا کیا کریں!''

ایک نے دوسرے سے پوچھا اور دونوں پوسٹر چپکانے والوں کی لاشوں کی طرف اِشارہ کیا۔

''یار بور مت کر خود ہی کارپوریشن والے لے جائیں گے صبح کوڑے کے ساتھ!''

''چلو بھئی پوسٹر لگواؤ، پھر جا کر اچھی سی چائے پیتے ہیں!''

اب دونوں پارٹیوں کے پوسٹروں سے گول چکر کا گھیرا سج چکا تھا۔

دونوں پارٹیوں والے ہاتھ مِلا کر شب بخیر کہہ کر جا چکے تھے۔

''ادھر آ! کہاں مر جاتا ہے! میرے ساتھ رہا کر!''

بوڑھی افغانی دادی نے اپنے ساتھ آٹھ سالہ پوتے کو کوڑے کے ڈھیر میں سے ایک ٹوٹا ہوا کھلونا چُنتے ہوئے دیکھ کر آواز دی۔

آج کل کتنے اچھے دن ہیں۔ ٹھیک ٹھاک دیہاڑی لگ جاتی ہے۔ چالیس روپے من کے حساب سے بھی کاغذ چن کر لے جاؤ تو پچاس ساٹھ تو بن ہی جاتے ہیں۔

بوڑھی دادی نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے کھلنڈرے پوتے کی طرف دیکھنے لگی۔ صبح صبح کام کا وقت ہوتا ہے مگر یہ بچہ کہنا نہیں سنتا بس کھیلنے کی دھن سوار رہتی ہے اس پر۔

''دادی ٹھیک ہے؟''

اس کے میلے کچیلے ننھے پوتے نے گول چکر کے اِردگرد کے گھیرے میں لگے لال اور سبز پوسٹروں پہ نظر ڈال کر اجازت مانگی۔

''ٹھہر جا ارے شیطان! تجھ سے اکیلے بھلا یہ کام کہاں ہوگا۔ میں بھی تیرے ساتھ لگوں گی تو کچھ بنے گا نا!''

دادی خوشی اور فخر سے اپنے پوتے کی نئی دریافت پہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ اپنا بڑا سا جھولا لٹکا کر اس کے پاس چلی آئی اور دونوں نے مِل کر جلدی جلدی گھیرے پر چپکے کاغذوں کے ٹکڑے نوچ نوچ کر اپنا جھولا بھرنا شروع کر دیا۔

محمد حامد سراج

اُلٹے پاؤں

(کاشف مجید کے نام)

ہمارے پاؤں الٹے تھے فقط چلنے سے کیا ہوتا
بہت آگے گئے لیکن بہت پیچھے نکل آئے

عجیب کسلمندی سی رچی تھی اس کی طبیعت میں۔۔۔جانے سفر پر نکلنا اس کے مزاج پر اتنا گراں کیوں گزرتا تھا۔ایک گھریلو مصروفیت کی وجہ سے اسے میانوالی سے ملتان تک ہی تو جانا تھا۔تمام بڑے شہر اس کے گاؤں سے قریباً تین ساڑھے تین سو کلومیٹر کی مسافت پر تھے۔لاہور اور ملتان تین سو پچاس کلومیٹر اور راولپنڈی اسلام آباد دو سو اسّی کلومیٹر کی دوری پر تھے۔وہ گھر سے ایک دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر نکلا اور دوست سے کہا کہ میانوالی سے ملتان جانے والی شاہراہ پر وہ اسے ''گولے والا'' سٹاپ پر چھوڑ آئے تاکہ وہ وہاں سے بس پکڑ سکے۔موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہی اسے خیال آیا میں تو ہمیشہ سے سفر میں ہوں۔زندگی ایک سفر ہے جس روز پیدا ہوا تھا اسی دن سے یہ سفر جاری ہے وقت کی آری عمر کو کاٹتی چلی جا رہی ہے۔ایک روز یہ درخت دھڑام سے زمین پر آ رہے گا اور دیمک کی خوراک بن جائے گا۔یہ روز کا سفر بھی بھلا کبھی اس کائنات میں تھما ہے۔آنکھ کھلنے پر مشقت کا سفر کھینچنا اور رات گئے چارپائی پر چند گھنٹوں کا آرام وہ بھی نصیب میں ہو تو وگرنہ موجودہ نسلِ انسانی جو زمین پر سانس کھینچ رہی ہے وہ نیند کی ادویہ کے سہارے مصنوعی نیند لیتی ہے۔۔۔

یہ ''گولے والا'' ہے بڑی شاہراہ پر ایک چھوٹا سا قصباتی سٹاپ' تین چار چھپر ہوٹل' مشرقی سمت ایک چھپر کے نیچے کسی نے لقمہ کمانے کے لیے بلیرڈ ٹیبل لگا رکھی ہے جس پر پاس کے دیہات سے یا وہ ٹیکسی ڈرائیور جو گولے والا سٹاپ پر سارا دن سواری کا انتظار کھینچتے ہیں' بلیرڈ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ساتھ میں ایک کارڈ بلر کی دکان ہے جس میں وہ سارا دن نوگیٹی یا لُڈو کھیلتے ہیں۔اکا دکا دکانیں منیاری کی بھی ہیں۔موٹر سائیکل پر اسے جو دوست چھوڑنے آیا تھا وہ اسی لمحے اسے اتار کر

واپس مڑ گیا تھا۔اس نے شاہراہ پر شمال سے جنوب جانے والی گاڑیوں پر نظر رکھنے کے لیے ایک ایسے چھپر ہوٹل کا انتخاب کیا جہاں ٹوٹی چارپائی پر بیٹھا وہ چائے سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ شمالی سمت سے آنے والی ٹریفک پر نظر بھی رکھ سکتا تھا۔اس نے چائے کی ایک پیالی کا کہا اور چارپائی کے کونے پر ٹک گیا۔سوچنا اس کے مزاج کا حصہ تھا۔اس کی خواہش ہوتی تھی وہ ہمیشہ اچھی بات ہی سوچے لیکن دکھ اور مسائل بھی اس کی سوچوں میں درآتے' وہ انہیں جھٹک کر اپنی کہانیوں کے بارے میں اکثر سوچا کرتا۔اس کی آنکھ کے آئینوں میں کتنی ہی کہانیوں کے عکس محفوظ تھے۔ لیکن ہر کہانی کو افسانہ بنانے کا خبط اس پر حد تک اس پر طاری رہتا کہ برسوں بعد وہ بنت کاری سے عمل سے گزرتا لیکن پھر بھی سر جھٹک کے اپنے آپ کو کوستا یہ افسانہ نہیں ہے تم نے جھک ماری ہے۔ یہ سفر بھی برسوں سے اس پر طاری تھا' کتنے برس۔۔؟ وقت کے پیمانوں کی شماریات کا عمل اسے ہمیشہ اُلجھا دیتا تھا۔

''گولے والا سٹاپ'' پر تیز میٹھے اور تیز پتی والی چائے کے دوران اسے وہ پاگل بھی یاد آیا جو ایک پتھر ہاتھ میں تولے سارا دن گھومتا رہتا تھا۔۔۔منہ سے ٹپکتی رالیں' میلے چیکٹ کپڑے' چند مخصوص جملے۔۔۔جو اس کا معمول تھے۔

سارے شیشے توڑ دوں گا۔۔۔

ٹریفک جام کر کے رکھ دوں گا۔۔۔

پاکستان کی پولیس کو بحرالکاہل میں ڈبو دوں گا

یہ دوائی کس ''کریانہ سٹور'' سے ملتی ہے۔۔۔؟

یہ پتھر دیکھ رہے ہو۔۔۔یہ بم ہے۔۔۔بم۔۔۔کوئی میرے قریب تو آ کے دیکھے۔۔۔ ماردوں گا۔۔۔

''گولے والا'' میری ریاست ہے کوئی اور مائی کا لعل آ کے تو دیکھے۔۔۔بم مار دوں گا۔۔۔اس پر صرف میرا سکہ چلے گا کیوں کہ میرے پاس پتھر ہے۔۔۔!

ایم اے پاس وہ پاگل جو ایک شب اپنی جان بلب بیٹی کے لیے گھر سے دوائی لینے کو نکلا تھا' اسی لمحے کہیں قریبی گھر سے پولیس نے چھاپہ مار کر چند جواریوں کو پکڑا اور گلی میں جاتے اسے دیکھ کر اس کی ہر دلیل کو نظر انداز کر کے اسے گاڑی میں پھینک ''دارالامن'' لے گئے۔اس کی خوب خاطر تواضع کی گئی۔تیسرے روز جب اسے رہا کیا گیا تو اس وقت تک اس کی بیٹی زندگی سے رہائی پا چکی تھی۔۔۔وہ بھی اسی لمحے حواس سے رہائی پا کے گلیوں اور بازاروں میں کاغذ چننے لگا۔کاغذ کے

ہر ٹکڑے پر اس کی بیٹی کا نسخہ لکھا تھا۔۔۔وہی بم جو وہ ہاتھ میں تولتا پھرتا تھا اس کی کیا جان لیتا ایک صبح اس نے ملتان سے آنے والی کوچ جو گولے والا سے گزر رہی تھی اس پر پتھر تولا' شاید ڈرائیور نیا تھا جسے اس پاگل سے شناسائی نہ تھی' اس نے پاگل کے بچانے کو سٹیرنگ داہنی جانب کاٹا اور سامنے سے آنے والی بہتر سیٹر بس سے جا ٹکرایا۔۔۔دھماکے کی آواز دور دور تک سنی گئی' بائیس جانیں چلی گئیں' بائیس گھر اجڑ گئے لیکن وہ تو پاگل تھا' اسے کیا معلوم کیا حادثہ گزرا ہے۔۔۔اسے پولیس پکڑ لے گئی۔۔۔

آپ اُکتاہٹ کا شکار تو نہیں ہونے لگے۔۔۔برق رفتار زندگی میں قاری اب کہانی بھی برق رفتار مانگتا ہے۔یہ کوئی لمبی کتھا نہیں ہے۔۔۔آپ میرے ہم سفر ہیں میں کوشش میں تو ہوں کہ آپ اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں۔یہ بھی خدشہ ہے کہ میانوالی سے ملتان جانے والی بس میں وی سی ڈی ہو تو آپ فلم میں کھو جائیں گے اور یہ کہانی۔

یہ سفر ادھورا رہ جائے گا۔۔۔میرے خیال میں یہ جو سامنے سے بس آرہی ہے' جس کا ماتھا سجا ہوا ہے اور چمک رہا ہے یہ وہی بس ہے جس کا مجھے انتظار ہے' ڈرائیور کا ہاتھ مسلسل ہارن پر ہے اور ہارن اس بات کی علامت ہے کہ بس میں سیٹیں خالی ہیں۔۔۔دیکھیے نا۔۔۔میں نے چھپر ہوٹل کے نیچے بیٹھ کر آپ سے باتیں کی ہیں۔۔۔آیئے آپ بھی میرے ساتھ چلئے آپ بور نہیں ہوں گے۔۔۔

بریک لگنے کی چر چراہٹ' فرنٹ ڈور کا ڈنڈا تھامے آدھا باہر لٹکتا کنڈیکٹر' اس کی آواز کی لیک' سرائے مہاجر' چوک اعظم' چوک منڈا' مظفر گڑھ' ملتان اے۔۔۔!

استاد جی۔۔ایک سواری ہے۔۔۔بس۔۔۔!

یار میں نے ملتان جانا ہے

واہ۔۔۔''توڑ' دی سواری اے''۔۔۔(ملتان تک کی سواری)۔۔۔

آؤ جی آؤ۔۔۔ڈرائیور کی پیچھے والی سیٹ پر بیٹھو۔۔۔اس نے ایک سواری جسے قریباً بیس کلومیٹر بعد چاندنی چوک اُترنا تھا' وہاں سے اٹھ کے پیچھے جا بیٹھنے کو کہا' سواری نے برا سا منہ بنایا اور ناگواری سے اٹھ کر پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔۔۔وہ ڈرائیور سے پچھلی سیٹ پر جم کے بیٹھا اور خیالوں میں کھونے سے پہلے گردوپیش پر نظر ڈالی۔ڈرائیور کے بال تیل سے چپڑے ہوئے اور مانگ درمیان سے نکلی ہوئی' خشخشی ڈاڑھی کو اس نے خوب جما کر بٹھایا ہوا تھا' بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں اس نے موٹے نگ والی تین انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں' آنکھوں میں سرمے کی دھاریں۔۔۔کنڈیکٹر نکلتے

ہوئے قد کا ایک کرخت خال وخد کا نوجوان تھا' شیو بڑھی ہوئی' دائیں کان میں پیلے رنگ کی بال پوائنٹ اس نے اڑس رکھی تھی' کپڑوں کا رنگ میل خورا' جوتی پھٹی ہوئی۔۔۔ساتھ میں ایک ہیلپر بھی تھا۔۔ایک پندرہ سولہ سال کا بچہ' چہرے پر تکان اور نیند سے بوجھل آنکھیں' اس کے کپڑوں اور گردن پر بھی میل کا رنگ ایک سا تھا۔لگتا تھا اسے بستر سے کھینچ کر بس میں ڈال لیا گیا۔

چاندنی چوک کے سٹاپ پر کچھ سواریاں اتریں کچھ نئے مسافر ہمسفر ہوئے۔۔۔بس چلتی رہی۔۔۔یہ ایک ریگستانی پٹی ہے' سرائے مہاجر کے بعد ایک جگہ اچانک بس رکی' ڈرائیور چھال لگا کے اترا اور سڑک پار کر کے جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔

استاد کہاں گیا۔۔۔؟

پیشاب کرنے گیا ہے۔۔۔

ایک ایک کر کے سواریاں بس سے اتریں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چلی گئیں۔۔۔

اس موئے ڈرائیور کو میں نے کہا تھا کہ بچے نے پیشاب کرنا ہے اس وقت گاڑی نہیں روکی۔۔۔

ہیلپر۔۔۔جسے کنڈیکٹر ''چھوٹا'' کہہ کر پکارتا تھا۔۔۔

''اوئے چھوٹے'' ٹائر ٹھوک بجا کے دیکھ لے۔۔۔

سواریاں واپس بیٹھ چکی تھیں'

چھوٹے نے سارے ٹائروں کو ٹھوک بجا کے دیکھا اور آواز لگائی ''استاد ڈبل اے۔۔۔''

یہ ''چوک اعظم'' کا ایک ٹرک اڈہ ہوٹل ہے۔۔۔سفر کے دوران سارے ہوٹل ایک سے ہوتے ہیں۔۔ایسے ہوٹلوں پر مناسب داموں میں کھانا کھایا جا سکتا ہے' چائے پی جا سکتی ہے' کشادہ برآمدوں میں بچھی بڑی بڑی چارپائیوں پر کمر سیدی کی جا سکتی ہے۔پاکستان میں سفر کے دوران کچھ شاہراہوں پر سواریوں کی جیب خالی کرنے کے لیے لگژری ہوٹلوں کا قیام عمل میں آیا لیکن وہاں اکا دکا کاریں ہی کھڑی دیکھنے کو ملتی ہیں۔۔۔عوامی ہوٹلوں کا آباد ہونا ہماری سادگی اور سفید پوشی کا مظہر ہے۔ہم ایک ترقی پذیر ملک کے شہری ہیں۔۔۔

آپ کے چہرے کے آثار بتا رہے ہیں کہ آپ اکتاہٹ کا شکار ہونے لگے ہیں۔۔۔

دیکھیے آدھا سفر مکمل ہوا۔۔۔آدھا باقی ہے۔۔۔تھکاوٹ تو سفر میں ہو جاتی ہے۔۔۔منزل پر پہنچ کر سانس لے لیں گے۔

اب ایک نیا موڑ ہے۔۔۔ذرا جھانک کر تو دیکھیے۔۔۔! پیٹ پوجا کے بعد سواریاں

اپنی اپنی سیٹ پر اطمینان سے بیٹھی ڈرائیور کا انتظار کر رہی ہیں ایک دو مسافر ابھی بس کے ساتھ ٹیک لگائے سگریٹ پی رہے ہیں۔ایک سواری جیب سے پرس نکالے ہوٹل والے کو اپنا بل ادا کر رہی ہے۔سامنے چند سواریاں نمازِ ظہر ادا کر کے نکل رہی ہیں۔

ڈرائیور نے سیٹ سنبھالی۔۔۔

ایکسلیٹر پر پاؤں کا دباؤ ڈالا۔۔۔بار بار ہارن بجایا تاکہ کوئی سواری رہ نہ جائے۔۔۔

تحیر نے اس لمحے اسے لپیٹ میں لیا جب اس کی نظر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ڈرائیور کے چہرے پر پڑی۔اسے اپنی بینائی پر شک ہوا اس نے ایک بار باہر کے منظر پر نظر ڈالی' ایک چرواہا اپنی بھیڑیں ہانکنے لیے جا رہا تھا' ایک گدھا گاڑی پر کسی مریض کو لٹا کر شاید ڈسپنسری لے جایا جا رہا تھا' چند بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔۔۔اس نے اپنے من میں جھانکا' اندر باہر کے منظر یکساں تھے۔ یہ ڈرائیور وہ نہیں جو میانوالی سے اس سیٹ پر بیٹھا تھا اور گولے والا سے وہ اس کے سنگ سفر میں تھا۔۔۔اب ڈرائیونگ سیٹ پر ایک سندھی ٹوپی والا درمیانے قد کا شخص تھا۔وہ پہلے والا ڈرائیور کہاں گیا۔۔۔؟ یہ کہاں سے آیا۔۔۔اسے کس نے اجازت دی ہے کہ یہ ہماری بس چلائے۔۔۔کیا یہ اپنے فن میں ماہر ہے۔۔۔؟ سواریوں میں چہ مگویاں جاری تھیں' مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ۔۔۔

بس چلی تو اس کے انجن سے عجیب و غریب گڑگڑاہٹ کی آوازیں نمودار ہونے لگیں۔۔۔

شاید کوئی فنی خرابی ہے۔۔۔؟

ڈرائیور کیوں بدلا۔۔۔؟

بس کی پچھلی سیٹ پر ایک مخبوط الحواس سواری جس کی شکل اس پاگل سے مشابہت رکھتی ہے جو گولے والا میں پتھر تولے گھوما کرتا تھا۔اس نے کہا۔

بس میں کوئی فنی خرابی ہے۔۔۔بس روکو۔۔۔بس روکو۔

لیکن اس کی بات پر کسی نے کیا توجہ دینا تھی۔۔۔مظفر گڑھ سے پہلے بگا شیر کے قریب بس رک گئی۔۔۔''چھوٹے'' نے لکڑی کے ٹول بکس سے اوزار نکالے' ڈرائیور اور کنڈیکٹر بس کے نیچے لیٹ کر اوزاروں کی مدد سے جس حد ممکن تھا اس کی مرمت کرنے کے بعد دوبارہ ہاتھ پونچھ کر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔۔۔بس چلی تو وہ سہم کر اپنے آپ میں سمٹنے لگا۔۔۔اب کے ڈرائیونگ سیٹ پر جو ڈرائیور تھا' اس کے سر کی اطراف میں چند بال تھے' اسے گنجا کہا جا سکتا ہے۔۔۔اس کے چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ تھی۔۔۔اس نے سواریوں سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔

فکر مندی کی کوئی بات نہیں۔۔۔گاڑی میں فالٹ معمولی ہے' مظفر گڑھ قریب ہے ہم

وہاں سے کسی میکینک کو دکھالیں گے۔

ڈرائیور پھر کیوں بدل دیا گیا۔۔۔؟

یار تمہیں کیا۔۔۔بس چل رہی ہے۔اللہ پر بھروسہ رکھو۔

بھروسہ تو مکمل اللہ پر ہے یار لیکن کوئی اناڑی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ہم سب بس سمیت جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

''بگا شیر'' سے ''مظفر گڑھ'' کی مسافت چند کلومیٹر تھی۔۔۔وہاں ایک ورکشاپ کے سامنے بس جا رکی۔میکینک اوزار لے کر بس کے نیچے گھس گیا۔ڈرائیور سامنے ایک ہوٹل پر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔سواریوں میں سے کسی نے ایک کھوکے سے پان سپاریاں اور کسی نے ریڑھی سے فروٹ خرید کر وقت گزارنا شروع کیا۔چھوٹے نے ڈول میں پانی بھر کے ریڈی ایٹر میں ڈالا۔ بس جب مظفر گڑھ سے نکلی تو حبس بڑھ گیا۔

استاد!اے۔سی چلاؤ۔۔۔دم گھٹ رہا ہے

ائر کنڈیشن کام چھوڑ گیا ہے

چناب پل کراس کرنے تک بس میں حبس اتنا بڑھ گیا کہ سواریاں چلّا اٹھیں۔۔۔

استاد۔۔۔کچھ کرو نہیں تو ہم مر جائیں گے۔۔۔

اغلب گمان یہی ہے کہ جب مظفر گڑھ سے بس نکلی تو جو ڈرائیور سامنے کھوکے پر چائے پی رہا تھا وہ وہیں رہ گیا۔۔۔کیوں کہ اس وقت ایک باوردی ڈرائیور نے سیٹ سنبھال رکھی ہے۔۔۔یہ بھی معلوم نہیں۔۔۔پہلے ڈرائیوروں کی مانند اس نے کب کیسے یہ سیٹ سنبھالی۔۔۔؟

اس نے ساتھ بیٹھی سواری کو ٹوہکا دیا پوچھا۔

''بھائی۔۔۔یہ باوردی ڈرائیور کب اس سیٹ پر بیٹھا''

پتا نہیں یار۔۔۔کیا یہ کوئی ہم سے پوچھ کر بیٹھتے ہیں۔اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بےزاری سے کہا۔

حبس کی وجہ سے سواریاں پسینے میں شرابور ہونے لگی تھیں۔۔۔کچھ نے گریبان کے بٹن کھول دیے۔۔۔ایک بار پھر بھنبھناہٹ سی اور مبہم گفتگو، جس کا کوئی مفہوم سمجھ میں آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔۔۔شاید یہ حبس کا اثر تھا۔۔۔!

بھائی کون سا شہر ہے۔۔۔؟

سکھر۔۔۔سکھر ہے

یا خدا۔۔۔میانوالی ملتان روڈ پر سکھر کہاں سے ٹپک پڑا۔۔۔؟

ابھی کوئٹہ کتنا دور ہے۔۔۔ایک بوڑھے شخص نے پوچھا

یار۔۔۔مجھے تو پشاور اترنا تھا

کیا۔۔۔لاہور آنے والا ہے بھائی۔۔۔؟

جانے کراچی پہنچنے تک ابھی یہ بس کتنی دیر لے گی۔۔۔؟

اماں بھیا۔۔۔کیا دلی آ گئی۔۔۔؟

دلی۔۔۔؟ کیا دماغ ٹھکانے ہے تیرا۔۔۔؟

یار میری ضعیف پھوپھی وہاں میرا انتظار کر رہی ہے۔۔۔

کیا واہگہ باڈر ہم کراس کر آئے۔۔۔مجھے ''کرنال'' کی خوشبو آ رہی ہے۔۔۔ایک انتہائی ضعیف اور خمیدہ کمر شخص نے پوچھا:

بابا جی۔۔۔جن شہروں کا آپ نام لے رہے ہیں وہ ہندستان میں ہیں۔

ہمیں کس بس میں سوار کرا دیا گیا ہے۔۔۔؟

وہ ایک شخص جو ''گولے والا'' سے سوار ہوا تھا اور جسے کنڈیکٹر نے ڈرائیور کی پچھلی نشست پر بیٹھنے کو جگہ دی تھی۔۔۔اس کا خیال تھا وہ مکمل ہوش میں ہے اور باقی سواریاں جس کی وجہ سے او؛ فول بک رہی ہیں۔۔۔اس نے بہت غور سے باہر کے منظروں کو جانچا۔۔۔

بس فتح پور سیکری سے گزر رہی تھی۔۔۔''مغلِ اعظم''۔۔۔ہاتھیوں کے پاؤں کی دھمک۔۔۔باادب، ہوشیار باش، نگاہ روبرو۔۔۔!

اسے یقین ہو گیا کہ اس کے حواس ابھی سلامت ہیں۔۔۔وہ ''گولے والا'' سے سوار ہوا تھا، چوک اعظم، اسلام آباد، پنڈی بھٹیاں، رواں اور اب بس فتح پور سیکری سے گزر رہی ہے۔

ممبئی، کولکتہ، کانپور، دلی، تلہ گنگ، فتح جنگ، کراچی، لاہور، جہلم سے ہوتے ہوئے یہ بس اسلام آباد پہنچے گی۔۔۔رواں دواں بس ایک جھٹکے سے رکی۔''چھوٹے'' نے سواری اتاری اور بس کا دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ یہ کوئی ایسی بڑی غلطی نہ تھی لیکن کنڈیکٹر نے پوری توانائی سے ایک زنّاٹے دار تھپڑ ''چھوٹے'' کو جڑ دیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ سب سواریوں نے اپنے اپنے گال پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اس نے بھی اپنا چہرہ ٹٹولا وہاں نشان اور جلن تھی لیکن۔۔۔تھپڑ کی تو خیر تھی۔۔۔سب سواریوں نے دیکھا ''چھوٹے'' کا چہرہ ہر طرح کے تاثر سے عاری ہے۔ چہرے پر درد، کرب اور دکھ کا کوئی پرتو نہیں تھا۔۔۔ایک مکمل سپاٹ چہرہ۔۔۔وہاں کوئی آنسو اترا، نہ احتجاج۔۔۔صدیوں

سے طمانچوں کا عادی چہرہ جیسے روبوٹ۔۔۔

حبس اور طمانچے سے بس میں موجود سواریاں دم گھٹنے سے مر گئی تھیں۔۔۔ یا۔۔۔ شاید ان میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہو۔۔۔؟

آخری بار ایک سواری کو اخبار کا صفحہ پلٹتے دیکھا گیا تھا۔۔۔

باوردی ڈرائیور آرام سے گاڑی چلا رہا ہے۔۔۔!

آپ کو یاد ہے نا۔۔۔ وہ ایک مسافر جو ''گولے والا'' بس سٹاپ سے سوار ہوا تھا۔۔۔ وہ غنودگی کی کیفیت میں ہے۔۔۔!

کیا آپ کو بھی اونگھ نے آلیا ہے۔۔۔؟''

کوئی تو بولے۔۔۔ سناٹے میں دم گھٹ چلا ہے

کیا بس میں کوئی ذی روح ہے۔۔۔؟

اس مسافر کی آواز صدیوں سے صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی ہے۔۔۔

''گولے والا''۔۔۔ سے سوار ہونے والا مسافر پریشان ہے کہ یہ بس کس کس دیار سے گزر رہی ہے۔۔۔؟ سارے منظر اپنا حسن کھو چکے ہیں۔۔۔ وہ سوچ رہا ہے کہ اسے تو میانوالی سے ملتان تک پہنچنا تھا۔۔۔!''

اصغر علی بلوچ

روشنی کا ننگ

وہ دونوں روشنی کی تلاش میں نکلے اور اندھیروں سے برسرِ پیکار ہوئے۔ انھوں نے سنا تھا کہ سورج کو گھیر گھار کر لانے سے بستی میں روشنی لائی جا سکتی ہے لیکن سورج کو کیسے گھیرا جا سکتا ہے انھیں معلوم نہ تھا۔ بہر حال وہ روشنی کے تلاشی تھے اور کلموہی راتوں کے نامختتم جنگل میں گھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے پیدا ہوتے ہی اپنے اردگرد اندھیروں کا راج دیکھا تھا۔ لوگوں کی دھواں دھواں شکلیں اور سڑے لیکھ تھے۔ لیکھوں جیسی کالی راتوں میں جب کوئی جگنو چمکتا تو ساری خلقت سے اس کے تعاقب میں دوڑ پڑتی۔ سچ ہے اندھیرا جتنا گہرا ہوتا ہے رتی بھر روشنی اتنی ہی انمول اور معتبر ٹھہرتی ہے۔ اندھیرا صدیوں کے رازدوں کا امین اور اَن گنت خوابوں کا خالق ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ تو پیدائشی طور پر اندھیروں کے عادی ہوتے ہیں اور انھیں اپنا مقدر سمجھ کے مطمئن ہو کر صبر و شکر کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ بعض مذہبی، سیاسی اور رُوحانی پیشواؤں کے تلقینی منشوروں میں صبر و رضا کے اَجر کو اتنا مبالغہ آرائی سے بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے حصے کی روشنی کی خواہش بھی گناہ تصوّر کی جاتی ہے لیکن شاید یہ قانونِ قدرت ہے کہ نابیناؤں میں بینا اور اندھیروں میں جگنو ہمیشہ پا جاتے ہیں۔ وہ دونوں بھی اپنے اندر کا چراغ جلا کر ہمیشہ اندھیروں سے نجات پانے کے بارے میں سوچتے رہتے تھے۔ شروع میں وہ روشنی کا سراغ پانے کے لیے اپنے بزرگوں کے پاس گئے لیکن ان کی تو آنکھوں کی پتلیاں تک پھر چکی تھیں، پھر وہ عازمِ سفر ہوئے کہ شائد کہیں سے رتی بھر روشنی ہاتھ آ جائے۔

اسی دھن میں چلتے چلاتے مغرب کی سمت واقع وہ ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں کے سب لوگ پیدائشی طور پر اندھے اور بہرے تھے۔ ان کی آنکھیں اندھی کھوہ اور کان گہری غار تھے۔ پتا نہیں وہ اپنی چیخ پکار سے کس کو بلا رہے تھے۔

انھوں نے اس بستی کے گرد چکر لگایا کہ کوئی ان کو دیکھنے سننے والا ہو لیکن سخت مایوس

ہوئے اور وہاں سے چل نکلے۔قریب ہی ایک ویرانے میں انھوں نے جگنو کی سی لکیر دیکھی تو لپک پڑے۔انھیں یوں لگا جیسے ان کے صدیوں کے رتجگے اور مسافت رنگ لائی ہے۔وہ روشنی کے مکمل وجود سے تو نا آشنا تھے لیکن بچپن سے جگنو کی ٹمٹماتی لو کو دیکھتے دیکھتے اس کا احساس کر سکتے تھے۔وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے تو روشنی ان کی بند آنکھوں پر دستک دینے لگی۔انھوں نے ایک بابا جی کی ہتھیلی پر ایک گھسمیلا چراغ دیکھا۔۔۔اس بزرگ نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ اندھیر بستی کے باسی ہیں۔وہ دونوں بابا جی کے حضور عاجزی سے عرض گزار ہوئے:

''بابا جی روشنی درکار ہے۔روشنی کا قحط پڑ گیا ہے۔ہمارے اجداد ہمیں اندھیروں کی گھٹی دے کر مر کھپ گئے ہیں۔پر اب ہم مزید اندھیروں میں نہیں جی سکتے۔ہم روشنی کے جویا ہیں۔''

بابا جی نے انھیں بہ غور دیکھا وہ شکل سے اندھیر بستی کے باسی لگتے تھے لیکن عقل سے نہیں۔یقین اور تلاش کا نور ان کے چہروں سے عیاں تھا۔بابا جی استغراق کے عالم میں ان سے گویا ہوئے:

''تمہارے جذبے کھرے اور یقین کامل ہے لیکن روشنی کا حصول آسان نہیں۔تم کچھ عرصہ میرے پاس رہو تا کہ روشنی کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے قابل ہو سکو۔اس کے بعد میں تمہیں ایک چراغ دوں گا۔''

انھوں نے بابا جی کی آواز پر لبیک کہا اور اس کے حجرے میں رہنے لگے۔وہ صبح شام اپنی آنکھیں چراغ پر جمائے رکھتے اور بھوک پیاس سے بے نیاز بابا جی سے روشن کہانیاں سنتے رہتے۔نامعلوم کتنے ہی سال بیت گئے۔آخر ایک دن انھوں نے دیکھا کہ بابا جی کا جسم گھلتے گھلتے جگنو کی روشنی کی لکیر جتنا ہو گیا ہے اور ہتھیلی پر رکھے چراغ کی لویں آخری ہچکیاں لے رہی ہیں۔۔۔وہ دونوں روشنی سے زیادہ ان کے لی پریشان ہو گئے۔۔۔بابا جی نے اپنی ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا:

''تم نے روشنی کے لیے بہت کشٹ کاٹے ہیں۔اب اس چراغ کو تمہاری ہتھیلی پر رکھنے کا وقت آ گیا ہے۔میری رگوں میں جتنا لہو تھا جل چکا ہے اب یہ چراغ جلانے کی تمہاری باری ہے۔یاد رکھو اسے بجھنے نہ دینا۔''

دیکھتے ہی دیکھتے بابا جی چراغ کی لَو کی طرح اُوپر کو اُٹھنے لگے اور گھپ اندھیری رات کے آسمان پر ایک چمک دار ستارے کی مانند جگمگانے لگے۔ان دونوں نے چراغ کو سنبھالا اور

واپسی کی راہ لی۔ وہ جنگلوں اور دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے اپنی بستی کی طرف چل پڑے۔ دونوں ہتھیلی بدلتے رہتے لیکن چراغ کی لو مدھم نہ ہونے دیتے۔ اندھیرا ان کے آگے آگے ان سے گریزاں گریزاں بھاگنے لگا۔ آخر کار وہ اپنے وطن پہنچ گئے۔ ان کی ہتھیلی پر جلتا ہوا چراغ بستی کے اندھیروں کو للکارنے لگا اور اندھیر بستی کے باسیوں کی ابدی نیند سوئی آنکھیں کھلنے لگیں۔ وہ خود تو کالک میں ملفوف تھے لیکن چراغ بکف روشنی کے علم برداروں کو دیکھتے ہی انھیں سنگسار کرنا شروع کر دیا۔ وہ عجیب وحشیانہ انداز میں چنگھاڑنے لگے:

''اوئے یہ دونوں تو ننگے ہیں۔ بے شرموں اور بے حیاؤں کو بستی سے نکال دو۔ یہ دونوں ہمارے بھرم، دھرم اور ریت رواج کے ماتھے پر دھبہ ہیں۔ انھیں سنگسار کرو۔''

بستی کے ہر چھوٹے بڑے کے ہاتھ میں پتھر تھے اور وہ لہو جس سے چراغ جل رہا تھا بے دریغ زمین پر بہہ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ چراغ کی لَو کپکپانے لگی اور وہ دونوں لو کی مانند آسمان کی طرف پرواز کرنے لگے۔ اندھیر بستی کے لوگوں نے اُوپر دیکھا تو وہ دونوں ستاروں کا رُوپ دھار چکے تھے اور زمین پر جہاں جہاں ان کا لہو گرا تھا وہاں وہاں چراغ روشن ہو گئے تھے۔

اب اس بستی کے اندھوں کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں اور وہ ایک دوسرے پر بُری طرح برس رہے تھے:

''او بے شرمو! تم ننگے ہو۔۔۔''

''او تم بھی ننگے ہو۔۔۔''

''او اپنے منہ سے کالک پونچھو۔''

''اوئے پہلے تم تو اپنا منہ دیکھو۔۔۔''

لعن طعن اور منہ پھٹکار کا اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

آبگینے شاہ

قرض

رانی کے لیے یہ جوڑا خریدتے وقت وہ بہت خوش تھی۔ایک اچھی چیز سستے داموں اس کے ہاتھ آ گئی تھی ورنہ تو عید کے باعث قیمتیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔رانی اسے پہن کر بالکل گڑیا لگے گی یہ سوچتے ہی اِس کے لبوں پر ایک خفیف سی مسکان نمودار ہوئی پر فوراً ہی معدوم ہو گئی اور چہرے پر وحشت اور خوف کے آثار ظاہر ہوئے حالانکہ اب وہ اپنے گھر کے نہایت قریب آ گئی تھی تمام سفر کی کلفتیں ایک طرف اور اپنی اس چھوٹی سی گلی کا فاصلہ ایک طرف تھا جہاں سے گزرنا اس کے لیے عذاب بن گیا تھا اب۔شام ہونے والی تھی اور محلے بھر کے ''چھٹے ہوئے'' گلی کے نکڑ پر پتنگوں کی طرح جمع ہو جاتے۔

اُس کی مجبوری تھی کہ گھر لوٹنے کا وقت ہی یہی تھا۔جس فیکٹری میں وہ پیکنگ کا کام کرتی تھی اس کا مالک لگاتار آٹھ گھنٹوں تک کام لیتا تھا۔چنانچہ آتے آتے شام ہونا لازمی تھا اور ان لفنگوں کا سامنا بھی ایک کڑوا گھونٹ تھا جو اُسے روز پینا پڑتا۔''کاش آپ ہمارے ہوتے'' اب بھی اسے دیکھتے ہی ایک لوفر نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اِک ادا سے کہا تو اس نے اپنی سفید سولی چادر کی پلّو کو بے اختیار ماتھے تک کھینچا''توبہ تیرے نخرے'' ایک اور لفنگے نے اپنے بھدے پیلے دانتوں کی نمائش کی۔آوازے روز کسے جاتے مگر وہ روزانہ نئی طرح سے گھبرا جاتی۔گرمی نہ ہونے کے باوجود اس کی ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹ پڑا لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی بالآخر وہ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچی کانپتے ہاتھوں سے زنگ آلود تالا کھولا اور گھر میں قدم رکھا۔پیپل سے گرے ہوئے خشک پتے اس کے پاؤں تلے چُرمُرا کر رہ گئے وہ آنگن سے گزرتی ہوئی کمرے کے دروازے پر پہنچی یہاں بھی ایک اور زنگ آلود تالے سے گھر کی قیمتی چیزوں کی حفاظت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔حالانکہ وہ تمام کاٹھ کباڑ کا سامان تھا اور گھر میں جو کچھ قیمتی تھا وہ اس کی اپنی جوانی اور قیامت خیز حسن تھا۔

جب وہ دُلہن بن کر اس گھر میں آئی تھی تو محلے بھر میں اس کے حسن کی دھوم مچ گئی تھی اس کے شوہر کمالے کی ماں اِتراتی پھرتی تھی، چاند جیسی بہو لانے پر۔سحر خیز رُوپ کی بدولت ساحرہ نام بھی اس پر خوب جچتا تھا۔اور اب تو سوگواریت نے اس کے رُوپ کو دوآتشہ کر دیا تھا لوگوں کی نظریں اُسے اپنے جسم کو چھیدتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں اب وہ چارپائی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی اور دوپٹے کے پلّو سے آنکھوں میں آئی نمی کو سختی سے رگڑ ڈالا۔کمالا جب تک زندہ تھا آنسوؤں جیسی شئے سے واقف ہی نہ تھی وہ۔ایک خوبصورت تبسم ہمہ وقت لبوں پر رقصاں رہتا۔ساس اسے کچھ بھی بھلی بُری کہتی وہ کان لپیٹے ہنستی رہتی اور جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہتی اپنی دُھن میں مست و مگن وہ گھر کے کام نمٹائے جاتی یوں بھی شوہر کے گھر آنے سے پہلے پہلے وہ سارے دھندے سے فارغ ہو جانا چاہتی تھی کہ پھر وہ ہوا اور کمالا تب ان دونوں کے لبوں پر پیار کے گیت ہوتے اور آنکھوں میں محبت کے دِیپ جلتے۔جنھیں اب وقت کی بے رحم آندھی نے بُجھا دیا تھا۔پیار بھرے گیتوں کی جگہ سسکیوں اور سرد آہوں نے لے لی۔کمالا دِق کی ایک وبا کی نذر ہو گیا۔اس کی ساس نے کاسنی رنگ کی باریک اوڑھنی اس کے سر سے کھینچ کر سفید موٹی چادر اوڑھا دی کہ خدا کی اس رنگ بھری دُنیا میں اس کی بیوگی کی نمائندگی کے لیے ایک یہی رنگ رہ گیا تھا۔جو اب ہمیشہ اسے پہننا تھا۔محلے کی عورتوں نے دھیرے سے اس کی کلائی سے سہاگ کی چوڑیاں اُتار لیں۔

اگلے چار سال تک ساس زندہ رہی تو اسے کچھ سہارا رہا پر اس کے بعد تو جیسے وہ کھلے آسمان تلے ہی آ گئی۔جوان بیوہ گویا لاوارث زمین کے ٹکڑے کی طرح تھی اور ہر کوئی قبضہ کا خواہش مند تھا۔مردار خور گدھ اس کے چاروں اور ہر وقت منڈلاتے رہتے کہ کب وہ ہمت ہارے اور کب اسے نوچ کھائیں اور اس نے اگر ہمت پکڑ لی ہوئی تھی تو صرف رانی کی وجہ سے۔

وہ دِن بھر فیکٹری میں کام کرتی تو رانی کو ہم دیوار امّاں زینت کے گھر چھوڑ دیتی۔امّاں زینت کا بھی بڑا آسرا تھا اسے جو سارا دِن رانی کو بہلائے رکھتی اب بھی اس کے گھر میں آہٹ سن کر امّاں زینت رانی کو لیے اندر داخل ہوئی ''آ گئیں اے پُتر'' امّاں نے کمرے میں جھانکتے ہوئے اسے پکارا۔

''جی امّاں ابھی آئی ہوں۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''چل پھر رانی اپنی ماں کے پاس۔'' امّاں نے رانی کو دُلارتے ہوئے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

''امی میرا عید کا جوڑا لائی ہو؟'' رانی نے اس کے پاس آتے ہی جیسے کچھ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ دیکھو۔''اس نے تھیلے سے جوڑا نکال کر چارپائی پر پھیلایا۔

''کتنا خوبصورت ہے۔۔۔تو شہزادی لگے گی اسے پہن کر۔''

مجھے یہ جوڑا نہیں چاہیے! مجھے لال گھاگھرا بنا دو گوٹے کناری والا۔''رانی نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''رانی! سارے پیسے اس جوڑے پر خرچ ہو گئے اب کہاں سے بنوادوں تجھے لال گھاگھرا۔''

''اور عید سے بس چند دِن ہی رہ گئے ہیں اب کیسے بنے گا؟۔''اس نے رانی کو گود میں لیتے ہوئے سمجھایا۔

''نہیں میں یہ نہیں پہنوں گی۔''رانی اس کی گود میں مچلی۔

''میری سوہنی! اب تو آ گیا ناں عید کا جوڑا! بڑی عید پہ بنا دوں گی تھے گھاگھرا چولی۔ اس نے پیار سے اس کے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا۔

''نہیں! اِسی عید پر بنادو''رانی نے ضد باندھی''سارے بچوں کے اِتنے اچھے کپڑے ہوں گے پھر ککو کی بہن کا بھی لال گھاگھرا ہے گوٹے والا۔''

ککو کوابا ہیڈ کلرک ہے وہ بنا سکتے ہیں ایسے کپڑے، اس نے پریشان ہوکر وضاحت دی مگر رانی جس ناسمجھی کی عمر میں تھی وہاں ایسی وضاحتیں کام نہیں آتیں۔

''تو میرے لیے یہ گندا سا جوڑا لائی ہے، رانی نے غصے سے کپڑوں کا گولا سا بناتے ہوئے دیوار پر دے مارا۔تو ساحرہ کو بے اختیار اشتعال اُٹھا اس نے زور کا تھپڑ جڑ دیا رانی کے گال پر۔رانی گال پر ہاتھ رکھے وہیں فرش پر بیٹھ گئی اور رونے چیخنے لگی۔

جانے کیوں رانی روز بہ روز ضدی ہوتی چلی جا رہی تھی۔کبھی اُسے بھورے بالوں والی پلاسٹک کی گڑیا چاہیے ہوتی تو کبھی رنگ برنگی گیند،کسی دِن ہرے رنگ کی چوڑیوں کی فرمائش ہوتی تو کبھی لال گھاگھرے کی ضد۔

دو دِن سے کھانا پینا اور ماں سے بول چال بند تھی اور ساحرہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے انتظام کرے پیسوں کا۔تنخواہ ملنے سے بھی ابھی 20 روز باقی تھے اور ویسے بھی تنخواہ کے پیسوں سے تو راشن کا خرچ بھی بمشکل پورا ہوتا۔اگر وہ رانی کی یہ فرمائش پوری کرنے لگ جاتی تو دو تہائی پیسہ اسی پر خرچ ہونا تھا۔

''زبیدہ خالہ سے کمیٹی ڈال رکھی تھی اگر وہ مل جائے تو۔۔۔''اسے کمیٹی کا خیال آیا۔

''پر اس سے تو چھت پر مٹی ڈلوانی ہے بارش میں ایسی ٹپکتی کہ سارا کمرہ پانی سے بھرنے

لگا تھا اب۔'' اس نے خود ہی اپنے خیال کو ترک کیا۔

''اگر ککو کی ماں سے ادھار لے لوں تو۔۔۔کسی نہ کسی طرح واپس کر دوں گی۔۔۔ پر رانی تو خوش ہو جائے گی۔۔۔'' ککو کی ماں سے بات کرنا اگر چہ کافی مشکل مرحلہ تھا کیونکہ وہ ایک نک چڑھی عورت تھی۔ پر پیسہ کافی تھا اُوپر کی آمدنی کا اس کے پاس۔اس نے کلرک بابو کے گھر کا رُخ کرتے ہوئے سوچا۔

ککو کی ماں کے پاس پہلے تو فرصت ہی نہیں تھی تاہم اس پر ہزار احسان جتلاتے ہوئے بیٹھ گئی اس کے پاس۔ جیسے ہی اُدھار کی بات سنی فوراً مہنگائی کا رونا رونے لگی عین اسی وقت دروازے سے کلرک بابو نمودار ہوا اور ساحرہ کو دیکھتے ہی کِھل اُٹھا۔

''ارررے یہ ہمارے گھر میں اُجالا کیسے۔۔۔؟'' لہجے میں خود بخود شوخی در آئی۔ساحرہ اپنے آپ میں سمٹ گئی اور کلرک کی بیوی جل بھن گئی اور کُلستے ہوئے بولی'' ادھار مانگنے آئی ہے میں نے تو بتایا ہے کہ ابھی اپنے یہاں بھی تنگی ہے اُوپر سے عید کا خرچہ۔''

''نیک بخت! ہمسائے کی خبر گیری بھی ہمارا فرض ہے پھر'' اپنی'' ساحرہ کو ہم انکار تو نہیں کر سکتے ناں! کلرک بابو کرسی کھینچتے ہوئے پاس ہی بیٹھ گیا۔

کلرک کی بیوی کو اپنے شوہر کی کمینگی میں رتی بھر شبہ نہ تھا۔ پر اتنی ڈھٹائی کی توقع بھی نہ تھی۔وہ جز بز ہو کر رہ گئی۔ساحرہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی پر کلاک بابو نے پھرتی سے بٹوہ کھولا اور چند نوٹ گنتے ہوئے اس کی طرف بڑھا دیئے وہ ایک دم پیچھے ہٹی۔کلرک اسے ادا سمجھ کر دِل و جان سے فدا ہو گیا۔

''ارے رکھ لو! اپنا ہی مال سمجھ اسے ہمارے تمہارے میں کوئی فرق تھوڑی ہے۔'' وہ شہد بھرے لہجے میں بولا تو وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

''کیا ہم کو تم خود سے الگ سمجھتی ہو جو یوں کترا رہی ہو۔'' کلرک نے لاڈ بھرا شکوہ کیا تو کلرک کی بیوی میں مزید برداشت کی تاب نہ رہی اس نے آگے بڑھ کر نوٹ جھپٹ لیے اور ساحرہ کی مٹھی میں زبردستی تھماتے ہوئے اسے دروازے کی طرف دھکیلا کم بخت۔۔۔ پچھل پیری۔۔۔ بیوی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے پلٹی کلرک بابو نے جلدی سے اخبار اُٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا۔ بیوی کچھ دیر اُسے گھورتی رہی پھر ہاتھ میں پکڑا اسرو تازور سے میز پر پٹخا۔

چاندرات ساحرہ نے اس لال گھاگھرے پر گوٹا لگایا تھکاوٹ سے اس کا بدن چور تھا پر رانی کی خوشی اس کے ہر احساس پر حاوی تھی۔رانی اپنا من پسند گھاگھر چولی پہنے محلے میں تتلی بنی گھوم

پھر رہی تھی۔

سکو کی بہن نے اسے اپنے جیسے کپڑے پہنے دیکھے تو جل کر خاک ہوگئی پھر فوراً ماں کے پاس پہونچی اور روتے ہوئے رونے کی وجہ بتائی۔ سنتے ہی سکو کی ماں دروازہ کھول کر گلی میں نکل آئی رانی کو دیکھتے ہی اس کے تلووں سے لگی تو سر پہ بجھی۔

''حق ہاہا۔۔۔ اسے دیکھو!'' اس نے ہانک لگاتے ہوئے اپنی ہمسائی کو متوجہ کیا جو دروازے سے جھانک رہی تھی۔۔۔

''یتیم ہو کر ایسے بھڑک دار کپڑے چڑھا لیے ہیں اس رانی نے۔'' وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں حیرانی سے پھیلاتے ہوئے بولی۔

رانی ''یتیم'' ہونے کو اپنے لیے گالی سمجھتی تھی اس لیے محلے بھر کے شریر بچے اسے اور بھی چڑاتے تھے اس لفظ سے۔ اب بھی یہ بات اسے کوڑے کی طرح لگی۔

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہاتھ میں پکڑی ادھ کھائی قلفی سکو کی ماں کے چہرے کو تاک کر پھینکی۔ مارے غصے کے اس نے پکڑ کر رانی کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ گلی میں اچھا خاصا ہنگامہ ہو گیا۔ رانی نے بلند آواز سے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔

ساحرہ کو کسی نے اطلاع دی تو وہ بھاگم بھاگ پہونچی اور کلرک کی بیوی کے خونخوار پنجے سے بمشکل بیٹی کو چھڑایا۔

''اری چھٹانک بھر چھوکری ہمارے منہ کو آتی ہے۔'' اس کا غصہ ابھی تک آسمان کو چھُو رہا تھا۔

''آپا معاف کر دیں۔'' ساحرہ نے لجاجت سے کہا۔ رات بھر کی تھکن جیسے جسم میں عود آئی۔

''دفع دُور! اس نے غصے سے تھوکا۔'' اپنی چھوٹی سی کتیا کو گھر میں باندھ کر رکھا کر۔ ہر ایک سے پنگا لیے رکھتی ہے۔'' تجھے ذرا بھی احساس نہیں کہ شوہر تیرے سر پر نہیں بیوہ ہے تو! اور لڑکی کو سر پر چڑھا رکھا ہے ایسی اچھال چھکا قسم کی لڑکیاں کل کلاں کو محلے بھر کے لیے مصیبت بن جاتی ہیں۔ پھر ہر ایک یہی کہے گا جیسی ماں حرافہ ہے ویسی ہی بیٹی!'' کلرک کی بیوی نے دانت پیستے ہوئے اپنے دِل کی بھڑاس نکالی اور اپنے بچوں کو اندر کرتے ہوئے زور سے دروازہ بند کر لیا۔ ساحرہ نے بلکتی ہوئی رانی کو گود میں اُٹھایا، سینے سے لگا کر زور سے بھینچ لیا۔ ماں اور بیٹی کے آنسو لال گھاگھرے کو آنسوؤں کے گوٹے لگانے لگے۔

حافظ حیات

کلاس فیلو!

''تم ابھی تیار ہوئے کہ نہیں؟''

دوسری طرف فون پر نعمان کے دوست نواز نے پوچھا۔

''بس میں دس منٹ تک تیار ہو جاؤں گا۔''نواز نے جواب دیا اور جلدی سے ناشتہ کر کے موٹر سائیکل کی طرف لپکا۔

''بھائی! کچھ اور کھا لو تم نے اتنی سردی میں جانا ہے ایک چائے تو پی لیتے۔''

نعمان کے بھائی فرقان نے روکا۔

''نہیں بھائی بہت دیر ہو رہی ہے۔نعمان نے گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ گھڑی کب لی۔کتنی اچھی ہے۔''

''بھائی! یہ نواز کی ہے وہ کل میرے پاس ہی رہ گئی تھی۔''نعمان نے جواب دیا۔

نواز کے گھر پہنچ کر اُسے آواز دی اور دونوں یونیورسٹی کی طرف گامزن ہو گئے۔''آج تمہیں کچھ زیادہ ہی جلدی لگتی ہے۔''نواز نے پوچھا۔

''یار! نجمہ میرا انتظار کر رہی ہوگی کیونکہ اُسے لائبریری سے کتابیں ڈھونڈ کر دینی ہیں اور اسے اسائنمنٹ لکھنی ہے۔''اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یار تم نے بھی تو اُسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔''

''اچھا، اچھا، زیادہ باتیں نہ کرو، ورنہ یہیں اُتار دوں گا اور سردی میں یہیں کھڑے رہو گے۔''

وہ آٹھ بجے یونیورسٹی پہنچے مگر کلاس میں نجمہ نظر نہیں آئی۔وہ افسردہ ہو کر کمرہ سے باہر نکلا ہی تھا کہ اُدھر نجمہ بھی تیز تیز قدموں سے آ رہی تھی۔اس کا سانس تیز تیز چلنے کی وجہ سے پھولا ہوا تھا۔

''سوری (Sorry) تھوڑا لیٹ ہوگئی۔''نجمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''انگریز نے بھی کیا یہ پانچ حروف دیے ہیں ہمیں جو، انسان جتنی بھی کوتاہی، غلطی کر

لیں بس یہ الفاظ ادا کرے اور پھر بری الذمہ۔‘‘نعمان نے ناراض ہو کر کہا۔

’’اچھا جی، میں ’’معذرت‘‘ چاہتی ہوں جناب!‘‘

لفظ ’’معذرت‘‘ کے بھی پانچ حروف ہی ہیں۔‘‘ نعمان نے چھیڑا۔ دونوں مسکرائے اور لائبریری کی طرف روانہ ہوئے۔تھوڑی ہی دیر میں دونوں کے موبائل پر ایک SMS آتا ہے’’سر کلاس میں آچکے ہیں۔‘‘ دونوں جلدی جلدی کتابیں ایشو کروا کے کلاس کی طرف آ گئے۔

ٹیچر نے آج امتحانی نقطۂ نظر سے کچھ اہم موضوعات پر لیکچر دیا اور اختتام پر نعمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’مجھے اپنے اس شاگرد پر فخر ہے کیونکہ اس کم عمری میں جو لگاؤ اور علم سے محبت اس کی ہے مجھے اس عمر کے طلبہ میں کم ہی نظر آتی ہے،مَیں نے ابھی ایک رسالے میں اس کے مضامین پڑھے۔ اچھی کاوش ہے۔‘‘

کلاس کے بعد نجمہ ٹیچر کی باتیں یاد کر کے دِل ہی دِل میں خوش ہو رہی تھی۔کلاسز کے وقفے کے دوران وہ نعمان کے پاس آئی۔نعمان ایک رسالے میں اپنے تازہ چھپے ہوئے مضمون کو پڑھ رہا تھا۔

’’ایسے تو میں بھی کئی مضامین لکھ سکتی ہوں!‘‘ نجمہ نے چھیڑنا چاہا۔

’’جی جی۔ بلاشبہ آپ مجھ سے بہتر لکھ سکتی ہیں۔‘‘نعمان نے مسکراتے ہوئے ہتھیار پھینک دیئے۔’’ویسے ایک بات ہے اگر میں کہوں تو میری بات آپ مانیں گی؟‘‘نعمان نے کہا۔

’’جی ضرور۔‘‘

’’دیکھیں، آپ مجھ سے زیادہ ذہین ہیں،محنتی ہیں،لیکن آپ میں ایک کمی ہے کہ آپ خود کوئی چیز لکھ سکتی ہیں مگر آپ لکھتی نہیں۔ آپ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشیے اور لکھا کریں۔‘‘

’’دیکھو! یہ لکھنے لکھانے کا شوق تمہیں ہے تو تم لکھو، مجھے کیوں کہتے ہو؟ میں صرف اس لیے پڑھتی ہوں کہ مجھے امتحان میں اچھے نمبرز حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ میرا اور کوئی مقصد نہیں۔‘‘ نجمہ نے رُکھائی اور قدرے غصے سے کہا۔

’’مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ آپ صرف نمبروں کے حصول کے لیے پڑھتی ہو۔‘‘

’’تو اور کیا جی۔ ہر کوئی تمہاری طرح پاگل تھوڑی ہے جو اس فضول کام میں لگا رہے۔تم جو لکھتے رہتے ہو تمہیں اس سے کیا فائدہ ملا۔‘‘

نعمان حیرت زدہ آنکھوں سے کھڑا نجمہ کی باتیں سن رہا تھا کہ وہ کس قدر بلند آواز میں

اس سے بات کر رہی ہے۔نعمان کو اس بات کا بہت دُکھ ہوا اور وہ غصے سے لال رنگ کیے کلاس سے جلدی جلدی نکل گیا۔

نعمان نے غصے میں نواز کو بلایا۔ پیچھے سے کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی ہے۔نواز نے دیکھا کہ نجمہ تیز قدموں کے ساتھ آ رہی ہے اور نعمان کو آواز دے رہی ہے۔شاید نجمہ نے نعمان کی ناراضی کو محسوس کر لیا تھا۔نعمان چونکہ غصے میں تھا اس لیے سردی لگنے کی بجائے گرمی محسوس کی تو اپنی جیکٹ اُتار کر نواز کو پکڑا دی جسے نواز نے فوراً پہن لیا۔دونوں موٹر سائیکل سٹینڈ کی طرف جا رہے تھے۔ان کے پیچھے نجمہ اپنی ایک سہیلی ریحانہ کے ساتھ ان کو آوازیں دے رہی تھی،لیکن نعمان اس کی آواز سے بے نیاز ہو کر دریا کی روانی کی طرح چلا جا رہا تھا۔ابھی تھوڑی ہی دُور پہنچا تھا کہ یونیورسٹی میں دو گروپوں کے درمیان اچانک فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ نجمہ اور اس کی دوست دیوار کے ساتھ نیچے بیٹھ گئیں لیکن نعمان مزید تیز ہو گیا، پھر ایک زوردار فائر ہوا اور نواز زمین پر گر گیا۔اتنے میں نجمہ بھاگتی ہوئی وہاں پہنچی ہے جہاں نواز منہ کے بل پڑا ہوا تھا۔

''نعمان! خدا کے لیے آنکھیں کھولو۔ دیکھو میں سب کچھ لکھوں گی، مجھے پتا ہے تم مجھ سے ناراض ہو۔ پلیز! مجھے بتاؤ میں سب سے پہلے تمھیں کیا لکھ کے دوں؟''

وہ ابھی باتیں ہی کر رہی تھی کہ کوئی آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے اُس نے مڑ کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی کہ نعمان اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' نجمہ نے حیرت سے اِشارہ کیا۔

یہ نواز ہے میرا دوست،مگر تم پریشان نہ ہو اسے گولی نہیں لگی بلکہ ٹھوکر سے گرا ہے اور کمزور دِل ہونے کی وجہ سے بے ہوش ہوا ہے۔اتنے میں ایمبولینس آ گئی اور نواز کو ہسپتال لے جایا گیا۔

نعمان نے بائیک سٹارٹ کی اور ہسپتال جانے لگا۔جاتے ہوئے اُس نے نجمہ سے کہا:

''چاہو تو اِسی صورتِ حال پہ ایک افسانہ لکھو کہ تم نے محض جیکٹ کے شبہے میں مجھے زخمی سمجھ لیا۔''

نجمہ حیرت و مسرت کا پیکر بنی کھڑی تھی۔